WORLD SHIA MUSLIM ORGANISATION

"اپنی کتب کی حفاظت کرو کل تمہیں انکی ضرورت پڑیگی" قول معصومؑ

کتب اچھی حالت میں جاری کی جاتی ہیں۔ انھیں اچھی حالت میں ہی واپس کیجئے۔ کتابوں پر سیاہی کے دھبے، نشانات ورق پھاڑنا یا خراب کرنا خلاف ضابطہ ہے۔ کتب زائد المیعاد عرصہ کے لیے اپنے پاس نہ رکھیے بلکہ اسے اپنی پہلی فرصت میں واپس کیجئے:۔ (انتظامیہ امامیہ لائبریری)

فلسفۂ
ولایت

استاد مرتضیٰ مطہری

یکے از مطبوعات
جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان
پوسٹ بکس ۵۴۲۵ کراچی-۲

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No: 026797
★ MAILSI ★

ترجمہ ________ محمد فضل حق
نظر ثانی ________ رضا حسین رضوانی
کتابت ________ اشرف ندیم
مصحح ________ کاظم علی گجراتی
مطبع ________ شاہین پیکجز کراچی

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY
1333

جملہ حقوق محفوظ: یہ کتاب کلی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ راقم الحروف کی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریتاً کرائے پر دی جائے گی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کی جائے گی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنیوالے پر یہ شرط عائد نہ کرنے کیلئے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی۔ وائی کے نفسی۔

کچھ اپنے بارے میں

ایک بیدار مغز شخص، انسان کی فکری زندگی میں ایک عظیم تبدیلی رُونما ہوتے دیکھ سکتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجُودہ دَور کی توجّہ کا رُخ مادّے سے زیادہ رُوح کی جانب ہے اور سائنس داں کائناتی شعور، علتِ اولیٰ، عقلِ کُل اور قادرِ مطلق کے بارے میں سوچنے لگے ہیں۔

ہمیں انسانی ذہن کی مادّے سے روح کی جانب اس منتقلی پر بے انتہا مسرّت ہے کیونکہ یہ انسان کے روحانی ورثے کی پیش رفت کے بارے میں ہمارے مشن سے پوری پوری مطابقت رکھتی ہے۔ ادارہ اسلامک سیمینری کا بھی بعینہٖ یہی مطمحِ نظر ہے۔ یہ ادارہ اس رُوحانی ہدایت کی شمع کو روشن رکھنے کا متمنّی ہے جو کہ موجُودہ دَور کی ترقّی سے مکمّل طور پر ہم آہنگ ہے۔ یہ قرآنی طرزِ زندگی کو اس کی حقیقی پاکیزگی کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ اسے اس طرزِ خیال کے حامل بہترین اشخاص کی خدمات میسّر ہیں۔ یہ اسلام میں موجود ہر وہ مواد پیش کرتا ہے جو مکمّل طور پر معتبر اور مستند ہے۔ اس کی مطبوعات دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کو مدّ نظر رکھکر مرتّب کی گئی ہیں۔ یہ ایک عالمی ادارہ ہے اور اپنے مقاصد کی تکمیل کی خاطر اس نے ایشیا، افریقہ، امریکہ، کینیڈا، یورپ اور مشرقِ بعید میں دفاتر قائم کیے ہیں۔

انشاءاللہ ادارہ اسلامک سیمینری عِلم کا ایک ایسا دوامی چشمۂ فیض ثابت ہوگا جس سے شائقین جی بھر کر اپنی روحانی پیاس بُجھا سکیں گے۔

یکم ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ ہجری

قارئینِ گرامی!

یہ کتاب ادارۂ جامعہ تعلیماتِ اسلامی کی مطبوعات میں سے ہے۔ اِس ادارے کی مطبوعات کی تیاری کا مقصد دورِ حاضر کی رُوحانی ضروریات کا پورا کرنا اور بالخصوص اسلامی طرزِ فکر کو اُجاگر کرنا ہے۔ اِس ادارے نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ فقط وہی مواد پیش کیا جائے جو مستند ہو۔ اِس کتاب کی تیاری میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے اور ایسی معلومات بھی شامل کی گئی ہیں جو بہت گرانقدر رہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ اِس کتاب کا مطالعہ اُسی نقطۂ نگاہ سے کریں جس کے تحت یہ لکھی گئی ہے۔ آپ سے یہ استدعا بھی ہے کہ ہماری مطبوعات پر اپنی بے لاگ آرا تحریر فرما کر بھیجیں جو بڑی خوشی سے اور شکریے کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ کو اِس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اِس ارشادِ ربّانی کی تعمیل ہو سکے۔

"(اے رسول!) کہہ دیجیے: میں تمھیں بس ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کی خاطر اجتماعی یا انفرادی طور پر قیام کرو اور پھر غور کرو۔"

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔

تعاون کا طلبگار: سیکریٹری نشر و اشاعت

مصنّف کا تعارف

علامہ مرتضیٰ مطہری فروری ۱۹۱۹ء میں ایران کے صوبہ خراسان کے فاریمان نامی قصبے میں پیدا ہوئے جو مشہد مقدّس سے ۷۲ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ان کا تعلّق ایک مذہبی گھرانے سے تھا اور ان کے والد حاجی شیخ محمد حسین مطہری ایک ممتاز عالمِ دین اور بلند کردار بزرگ تھے۔ انھوں نے دینیات کی ابتدائی تعلیم اپنے والدِ بزرگوار سے ہی پائی۔

بارہ سال کی عمر میں علامہ مطہری حوزۂ علمیہ مشہد میں داخل ہوئے اور پانچ سال تک حصولِ علم میں مشغول رہے۔ بعد ازاں وہ دینی تعلیم کے عظیم مرکز قم چلے گئے جہاں وہ پندرہ سال تک مشہورِ عالم فلسفی علامہ محمد حسین طباطبائی اور مجاہدِ کبیر آیت اللہ روح اللہ خمینی سمیت کئی جیّد علماء کے زیرِ تربیت رہے اور اسلامی عقائد اور فقہ کی تعلیم مکمل کی۔ پھر وہ قم سے تہران منتقل ہو گئے۔

تعلیم کے دوران میں علامہ موصوف نے محسوس کیا کہ کمیونسٹوں نے اسلام کے خلاف ایک خُفیہ منصُوبے پر عملدرآمد شروع کر رکھا ہے اور وہ اپنے ناپاک ملحدانہ نظریات اسلامی فلسفے میں شامل کر کے اور آیاتِ قرآنی کی مادّی تعبیر کر کے اس مقدّس دین کو مسخ کرنے اور اس کی رُوح کو ملیامیٹ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اس عظیم فتنے کا سدِّ باب کرنے کے لیے اُنھوں نے مارکسی لٹریچر کا دقیق اور عمیق مطالعہ کیا تاکہ اس نظریے کا پورا پورا علم حاصل کر کے اس پر صحیح تنقید کر سکیں۔ چنانچہ اُنھوں نے اس موضوع پر متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان کے کچھ حصّے ازبر کر لیے۔

بلاشبہ مارکسزم وہ واحد چیز نہ تھی جس کی جانب علامہ مطہری نے اپنی توجّہ مبذول کی۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں تفسیرِ قرآن، فلسفہ، اخلاقیات، عمرانیات، تاریخ اور کئی ایک اور موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ ان کی تمام تصانیف کا حقیقی مقصد اسلام پر وارد کیے گئے اعتراضات کا جواب دینا اور دوسرے مکاتبِ فکر کی خامیاں اور اسلام کی عظمت واضح کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے مخالف نظریات رکھنے والوں کو بحث و مباحثہ کی دعوت بھی دی۔ تاہم علامہ موصوف کا عقیدہ تھا کہ مارکس ازم اور اسی جیسے دوسرے نظریات کو باطل ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان پر سائنسی انداز میں تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کا حقیقی چہرہ بھی پیش کیا جائے۔

ملحدانہ مکاتبِ فکر کے پیرؤوں کے لیے علامہ مطہری کی سرگرمیاں ناقابلِ برداشت تھیں چنانچہ انھوں نے آپ کو دہشت گردی کے ذریعے منظرِ عام سے ہٹا دینے کا فیصلہ کیا۔ بالآخر وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہوئے اور علامہ مطہری یکم مئی ۱۹۷۹ء کو شہید کر دیے گئے۔

علامہ مطہری کی شہادت ایک ایسا عظیم سانحہ تھی جس پر "موتُ العالِمِ موتُ العالَم" کا مقولہ صادق آتا ہے۔ آیت اللہ خمینی نے جب یہ رُوح فرسا خبر سُنی تو شدّتِ جذبات سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے انھوں نے اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا:

"میں اپنے ایک عزیز فرزند سے محروم ہو گیا ہوں۔ میں اُس شخص کی مَوت کا سوگ منا رہا ہوں جو میری زندگی کا حاصل تھا۔"

ہزاروں فرزندانِ توحید نے ان کے جلوسِ جنازہ میں شرکت کی۔ انھیں قم میں حرمِ معصومہؑ کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

علامہ مطہری ایران کے دینی اور ادبی حلقوں کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ وہ ایک عرصے تک تہران یونیورسٹی میں شعبۂ الٰہیات و معارفِ اسلامی کے عمید رہے۔

شہادت کے وقت وہ اسلامی جمہوریہ ایران کی دستور ساز کونسل کے صدر کے عہدے پر فائز تھے اور اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے۔

اُنھوں نے مختلف موضوعات پر بہت سی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں جو عربی، فارسی، ترکی، انگریزی اور اردو میں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے چند ایک کی اشاعت کا فخر جامعہ تعلیماتِ اسلامی کو حاصل ہے۔

عناوین

پیش لفظ

یہ کتاب جو دراصل فارسی میں لکھی گئی متبحر عالم آیت اللہ مرتضیٰ مطہری کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس میں ایک دلچسپ موضوع پر بحث کی گئی ہے، جس پر جہاں تک ہمیں علم ہے اس سے پیشتر قلم نہیں اٹھایا گیا۔

'ولی'، 'وَلا'، 'وِلا'، 'مولا' وغیرہ کے الفاظ کا ماخذ مشترک ہے اور اس کے مشتقات قرآن مجید اور حدیث میں ان کے لغوی، اصطلاحی اور دینی معنوں میں بکثرت استعمال کیے گئے ہیں۔ فقط قرآن مجید میں ہی یہ مختلف سیاق وسباق میں کئی سو مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ فاضل مصنّف نے ان کے لسانیاتی معنوں اور دینی کتابوں میں ان کے مختلف مفاہیم سے بحث کی ہے۔ بعض حلقوں میں ان الفاظ میں سے چند ایک کی تعبیر اور مفہوم کے بارے میں کچھ غلط فہمی پائی جاتی ہے اور مصنّف نے اس بارے میں ہر قسم کے شک وشبہ اور اُلجھن کو دُور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

لفظ 'ولی' قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ، رسولِ اکرمؐ، امام علیؑ اور عامتہ المسلمین کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مصنّف نے اس کتاب میں واضح کیا ہے کہ ہر موقع پر اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔

'ولا' کی کئی قسمیں ہیں اور ان کے مختلف درجے ہیں۔ فاضل مصنّف نے ان کا جو تجزیہ کیا ہے وہ دلچسپ اور فکر انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ طبع زاد بھی ہے۔ بہرحال انہوں نے اپنے خیالات کی تائید میں بہت سی قرآنی آیات اور احادیث بھی نقل کی ہیں۔ کتاب کا یہ حصّہ دقیق مطالعے کے قابل ہے۔

بحث کے دوران استاد محترم نے کئی ایک دوسرے اہم نکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے 'امامت' اور 'خلافت' کے مابین فرق واضح کیا ہے اور لفظ 'امام' کے مختلف معانی بیان کیے ہیں۔ یہ لفظ امتِ مسلمہ کے ایک دینی اور دنیاوی معصوم پیشوا کے لیے استعمال ہونے کے علاوہ امام جماعت، عالمِ دین، ممتاز سماجی اور سیاسی رہنما اور حاکم کے معنوں میں بھی مُستعمل ہے خواہ وہ حاکم اچھا ہو یا بُرا ہو۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے، کئی ایک ایسے امام بھی ہوتے ہیں جو لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور انہیں جہنم میں لے جاتے ہیں۔ احادیث میں بھی غیر عادل اماموں کا ذکر ہے۔

مصنّف نے ایک معصوم امام کے اوصاف اور فرائض منصبی پر بحث کی ہے اور بالتفصیل بتایا ہے کہ وہ کس نوعیت کی اطاعت، محبت اور احترام کا مستحق ہے۔ انہوں نے امام کی اس پوشیدہ قوّت کا ذکر بھی کیا ہے جس کی بدولت وہ دنیا کے کاروبار کی نگرانی کرتا ہے اور ان تمام شکوک وشبہات کا ازالہ کیا ہے جو اس بارے میں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

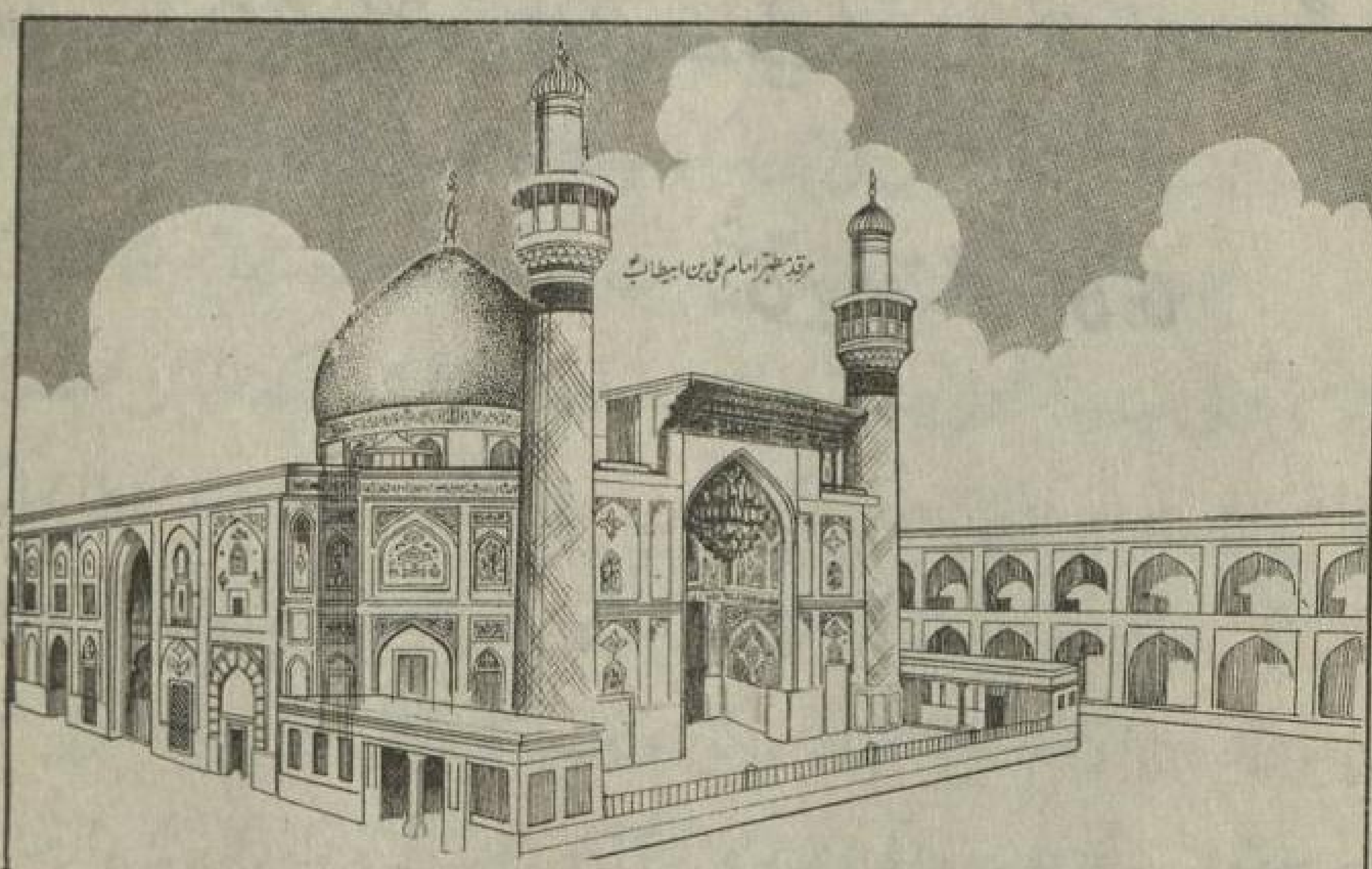
آیت اللہ مطہریؒ نے جن دوسرے نکات پر روشنی ڈالی ہے ان میں

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات، روحانی زندگی اور اس کے درجات، معجزوں کی ماہیت وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے ہر نکتے کا تجزیہ اس علمی تبحر کے ساتھ کیا ہے جس کے لیے وہ معروف ہیں اور ان کا نام کتاب کے گرانبہا اور عالمانہ ہونے کی ٹھوس ضمانت ہے۔

مذکورہ بالا کتاب کا اردو ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔ امید ہے جامعہ تعلیماتِ اسلامی کی یہ کوشش قارئین کے لیے دلچسپ اور مفید ثابت ہوگی۔

شیخ یوسف علی نفسی نجفی

□□□□□□□□□□□□□□



ولایۃ علی ابن ابی طالب حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مادۂ لفظی

الفاظ وَلا، وَلایت، وِلایت، ولی، مولیٰ، اولیٰ اور ان سے مشابہ کئی دوسرے الفاظ مادہ ولی سے مشتق ہیں۔ قرآن میں یہ مادہ اور اس کے مشتقات مختلف شکلوں میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۲۴ دفعہ بطورِ اسم اور ۱۱۲ دفعہ بطورِ فعل استعمال ہوئے ہیں۔

جیسا کہ راغب نے اپنے فرہنگ "مفردات القرآن" میں کہا ہے اس مادہ کے اصلی معنی ایک چیز کے دوسری چیز کے پہلو میں یوں موجود ہونے کے ہیں کہ ان میں کوئی فاصلہ باقی نہ رہے۔ اسی مناسبت سے یہ کلمہ قرب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، خواہ وہ جسمانی ہو یا روحانی اور یہی وجہ ہے کہ اس کے تمام مشتقات دوستی، محبت، حمایت، سرپرستی اور تسلّط وغیرہ کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں کیونکہ ان تمام الفاظ میں کسی نہ کسی قسم کے قرب اور اتصال کا تصوّر پایا جاتا ہے۔

مادہ 'ولی' اور اس کے مشتقات کے بہت سے معنی بیان کیے گئے

ہیں۔ مثلاً لفظ 'مولا' کے ۲۷ معانی بیان کیے گئے ہیں۔ تاہم یہ امر واضح ہے کہ ابتدا میں یہ لفظ ان تمام معانی کے لیے وضع نہیں کیا گیا ہوگا بلکہ فقط ایک اصلی معنی کا حامل ہوگا۔ جہاں تک دوسرے معانی کا تعلق ہے وہ سیاق و سباق سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

وَلایت اور وِلایت کے الفاظ کے استعمال کے بارے میں راغبؒ کا کہنا ہے کہ پہلے کے معنی 'مدد' کے اور دوسرے کے معنی کسی کام کی ذمہ داری سنبھالنے کے ہیں۔ تاہم درحقیقت دونوں لفظوں کے معنی ذمہ داری سنبھالنے کے ہیں۔ 'ولی' اور 'مولا' کے الفاظ کے بارے میں راغبؒ کا کہنا ہے کہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ یہ کبھی معروف صورت میں اور کبھی مجہول صورت میں استعمال ہوتے ہیں۔ پھر وہ ان کے موارد استعمال کا ذکر کرتا ہے۔

ولا کی دو قسمیں

قرآن مجید میں وَلا، 'موالات اور 'تولّا' (دوستی اور تعاون) کا ذکر اکثر آیا ہے اور اس کتاب مقدّس نے ان عنوانات کے تحت مختلف مسائل پر بحث کی ہے۔ قرآن مجید کے دقیق مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق ولا کی دو قسمیں ہیں: منفی اور مثبت — مسلمانوں کو مثبت ولا اختیار کرنے اور منفی ولا سے اجتناب برتنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس مثبت ولا کا حکم اسلام نے دیا ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں: — عام اور خاص — خاص ولا کو مزید کئی ایک اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی ولائے محبت۔ ولائے امامت۔ ولائے زعامت اور ولائے تکوینی۔

اب ہم ان میں سے ہر ایک کے بارے میں مختصر بحث کریں گے۔

منفی ولا

قرآن مجید نے مسلمانوں کو غیر مسلموں سے دوستی اختیار کرنے اور انہیں بطور سرپرست قبول کرنے سے بڑی سختی سے منع کیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلام مسلمانوں کے اپنے ہم جنسوں سے اچھے تعلقات استوار کرنے کے خلاف ہے یا وہ مسلمانوں کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ غیر مسلموں سے ہمیشہ برسرپیکار رہیں اور ان سے کوئی بھلائی نہ کریں۔ قرآن مجید واضح الفاظ میں فرماتا ہے:

> "جو لوگ تم سے تمہارے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ احسان کرنے اور انصاف سے پیش آنے سے منع نہیں کرتا۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"
>
> (سورۂ ممتحنہ۔ آیت ۸)

اسلام یہ نہیں کہتا کہ اچھے تعلقات صرف مسلمانوں تک محدود رہنے چاہئیں

یا یہ کہ مسلمانوں کو دوسروں سے کوئی ہمدردی نہیں ہونی چاہیے۔ ایک ایسا مذہب جس کے پیغمبرؐ کو قرآنِ مجید میں رحمۃ اللعالمین کے لقب سے یاد کیا گیا ہو اس قسم کے احکام کیسے دے سکتا ہے؟

دراصل مسلمانوں کو غیر مسلموں کی دوستی سے اجتناب برتنے کا حکم دینے کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کے دوستی کے دعووں کے باوجود مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کی معاندانہ چالوں اور سرگرمیوں سے غافل نہ رہیں اور ایسا نہ ہو کہ وہ دشمن کو دوست سمجھیں اور اس پر اعتماد کریں۔

ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو امتِ مسلمہ کا فرد اور کل کا جزو سمجھے۔ ایک معاشرے کے فرد کی حیثیت سے انسان پر خود بخود کچھ شرائط اور کچھ پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں۔ چونکہ غیر مسلم ایک الگ معاشرے کے افراد ہوتے ہیں اس لیے مسلمانوں کے ان کے ساتھ تعلقات ایسے ہونے چاہئیں جو ان کی اسلامی معاشرے کی رکنیت کے ساتھ ناسازگار نہ ہوں۔ انہیں اپنی آزادی اور سالمیت کو کسی قیمت پر بھی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ لہٰذا ایک مسلمان کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات اس نہج پر نہیں ہو سکتے جس پر مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

ضروری ہے کہ مسلمانوں کے باہمی تعلقات اتنے قریبی اور مخلصانہ ہوں جتنے کہ ایک مملکت کے افراد کے مابین بالعموم ہونے چاہئیں۔ اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق اس دوستی کا منفی پہلو اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ غیر مسلموں سے میل جول کے معاملے میں مسلمان اس بات کا خیال رکھے کہ اس کا واسطہ ایک غیر جماعت کے فرد سے ہے اور اس کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت ایک مسلمان کیساتھ تعلقات کی نوعیت سے مختلف ہونی چاہیے۔ مراد یہ ہے کہ ایک مسلمان

غیر مسلموں سے ایسے تعلقات نہ رکھے کہ عملی طور پر غیر مسلم معاشرے کا فرد بن جائے۔ اسے کسی وقت بھی یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ وہ امّتِ مسلمہ کا فرد ہے۔

ایک مسلمان کے لیے ایک غیر مسلم کے ساتھ شائستہ اور دوستانہ برتاؤ کرنے میں کوئی حرج نہیں تاہم اسے غیر مسلم کی ولا قبول نہیں کرنی چاہیے یعنی اسے اس جماعت کے فرد کی حیثیت نہیں دینی چاہیے جس سے خود اس کا اپنا تعلق ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ سلوک کے یہ دونوں انداز ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہیں۔

اسی طرح منفی ولا اور انسان دوستی کے اصولوں میں بھی کوئی منافات نہیں ہے۔ انسان دوستی اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان کو سبھی ابنائے آدم کے مستقبل اور ان کی بہتری اور خوشحالی کا خیال ہو۔ جہاں تک ایک مسلمان کا تعلق ہے وہ فطری طور پر تمام بنی نوع انسان کی فلاح کا طالب ہوتا ہے اور اسی بنا پر چاہتا ہے کہ سبھی لوگ دینِ اسلام قبول کر کے نجات حاصل کریں۔ تاہم جب تک وہ مشرف بہ اسلام نہیں ہوتے مسلمانوں کے مفادات کو ان کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل کو مٹایا جا سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ کچھ اشخاص کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انسان دوستی کا تقاضا ہے کہ ہم ان کی صحت یابی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں اور انہیں ہر قسم کی طبّی سہولتیں مہیا کریں اور ان کی علالت کے دوران میں ان سے ہمدردی اور شفقت کا برتاؤ کریں۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جو لوگ کسی وبائی مرض میں مبتلا ہوں انہیں دوسروں سے الگ نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ گو اسلام مسلمانوں کو غیر مسلموں سے ہمدردانہ سلوک کی اجازت دیتا ہے لیکن اس بات پر رضامند نہیں کہ وہ ان کی ذہنی اطاعت قبول کر لیں۔

اسلام بنی نوع انسان سے محبت کا مذہب ہے۔ وہ ایک مشرک سے بھی پیار کرتا ہے لیکن اس کے شرک کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کا رنج بھی ہوتا ہے کہ اس کا ایک ہم جنس راہِ راست سے بھٹک گیا ہے۔ اگر اسے اس کے ساتھ محبت نہ ہوتی تو وہ اس کی حالت پر ملول بھی نہ ہوتا اور نہ ہی اسے اس بات کی پروا ہوتی کہ آئندہ اس کا کیا بنے گا۔

اسلام میں محبت اور نفرت دونوں موجود ہیں لیکن یہ دونوں محض جذباتی اور اتفاقی نہیں بلکہ معقول اور منطقی ہیں۔ جو دوستی یا دشمنی محض جذبات کی بنا پر وجود میں آئے اس کی کوئی منطقی اساس نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسا اندھا اور بہرا احساس ہے جو ذہنِ انسانی پر چھا جاتا ہے اور جدھر چاہے اس کا رخ موڑ دیتا ہے۔ اس کے برعکس عاقلانہ دوستی اور دشمنی جو شعوری طور پر پیدا ہو اس کی اصل وجہ انسان کی اپنے ایک ہم جنس کی قسمت کے بارے میں پریشانی ہوتی ہے۔

ایک مثال: والدین کو اپنے بچے سے دو قسم کی محبت ہوتی ہے۔ ایک منطقی اور دوسری جذباتی۔ منطقی محبت بعض اوقات انہیں ایسے اقدام پر مجبور کرتی ہے جس کے نتیجے میں بچے کو تکلیف اور پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ مثلاً اگر کسی وجہ سے بچے کا آپریشن ضروری ہو جائے تو وہ اسے سرجن کے حوالے کر دیتے ہیں۔ گو ممکن ہے کہ وہ اس موقع پر روئیں لیکن اس کے باوجود وہ سرجن کو جلد از جلد آپریشن کرنے کو کہتے ہیں اور اس امر کی اجازت بھی دیتے ہیں کہ اگر وہ ضروری سمجھے تو متاثرہ

عضو کو کاٹ دے۔ وہ آنسو تو جذباتی محبت کی وجہ سے بہاتے ہیں لیکن آپریشن کرنے اور عضو کاٹنے کی اجازت منطقی محبت کی بنا پر دیتے ہیں۔ اگر وہ اپنی جذباتی محبت کو فوقیت دیں اور عضو کاٹنے کی اجازت نہ دیں تو وہ بچے کو فی الحقیقت موت کے منہ میں دھکیل دیں گے لیکن اپنی عقلی منطق اور بچے کی بہبود میں دلچسپی کی بنا پر وہ اپنی جذباتی محبت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور بچے کے تکلیف اور پریشانی اٹھانے پر آمادگی ظاہر کرتے ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنی صحت کی بحالی کے لیے ایک باشعور شخص ایک سرجن کے پاس جاتا ہے اور مثال کے طور پر اسے کہتا ہے کہ میری انگلی کاٹ دیجیے۔ درحقیقت وہ خوشی سے انگلی نہیں کٹوانا چاہتا اور نہ ہی اس درد اور تکلیف سے دوچار ہونا چاہتا ہے جو آپریشن کے نتیجے میں اسے ہوگی۔ اسے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ ایک انگلی کٹ جانے سے اسے کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تاہم اس کا شعور اور منطق اسے اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ درد سہہ لے اور عضوی نقص کو برداشت کرے۔ ایسے حالات میں جذبات نہیں بلکہ شعور اور منطق انسان کو آپریشن کرانے پر آمادہ کرتے ہیں۔

کفر اور جہالت میں مبتلا معاشرے سے فساد کا قلع قمع کرنے کے لیے اسلام ایک طرف تو جنگ لڑنے کا حکم دیتا ہے:

"ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۹۳)

اور دوسری طرف وہ مسلمانوں کو خبردار کرتا ہے کہ کافروں سے اپنے دل کی بات نہ کہیں تا کہ معاشرہ محفوظ رہے۔ اس طریقِ عمل اور بنی نوعِ انسان سے ہمدردی کے اصول کے مابین کوئی تضاد نہیں ہے۔

تقلید انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ انسان اکثر لاشعوری طور پر دوسروں کے خیالات اور نظریات اپنا لیتا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

"اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ کیا تم انہیں محبت کی پیشکش کروگے جب کہ دینِ حق سے انکار کرتے ہیں؟" (سورۂ ممتحنہ۔ آیت ۱)

اور پھر فرماتا ہے:

"اگر یہ لوگ تم پر قابو پالیں تو تمھارے دشمن ہو جائیں گے اور تمہیں ایذا پہنچانے کے لیے اپنے ہاتھ اور زبانیں تمہاری جانب بڑھائیں گے اور وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی کافر ہو جاؤ۔"

(سورۂ ممتحنہ۔ آیت ۲)

یہاں قرآن مجید اس امر کی وجہ بیان کرتا ہے کہ مسلمان کیوں کفار سے محتاط رہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کفار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنے طور طریقے اور نظریات دوسروں پر مسلّط کر دیں۔ پس ظاہر ہے کہ ان سے دوستی اور میل جول رکھنا کتنے بڑے خطرے کا موجب ہے۔

ان حالات میں ضروری ہو جاتا ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے بارے میں ہشیاری اور سوجھ بوجھ سے کام لیں۔ انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کا تعلق ایک ایسے معاشرے سے ہے جس کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے اور جو غیر مسلم معاشرے سے قطعاً مختلف ہے۔ تاہم اس کے یہ معنی

نہیں ہیں کہ مسلمان سرے سے غیر مسلموں کے ساتھ کوئی معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی رابطہ ہی نہ رکھیں۔ جو بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام روابط اسلامی معاشرے کے مختلف مفادات سے متصادم نہ ہوں۔

1333

مثبت ولا کی عام صورت

اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان ہر لحاظ سے منظم اور سماجی نقطۂ نگاہ سے مربوط اکائی کے طور پر آزادانہ زندگی بسر کریں۔ ہر فرد کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ایک جسم یعنی اسلامی معاشرے کا عضو تصور کرے تاکہ وہ معاشرہ قوت حاصل کرے کیونکہ قرآن مجید اسلامی معاشرے کو دوسری قوموں سے برتر دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ فرماتا ہے:

"بددل نہ ہو اور کڑھو نہیں۔ اگر تم سچے مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔" (سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۱۳۹)

ایمان کو برتری کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایمان ہی ہے جو اسلامی معاشرے کی وحدت کی بنیاد، اس کی شخصیت کا سہارا، اس کی آزادی کی ضمانت اور اسے متحرک رکھنے والی قوت ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

"آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم ہمت ہار دو گے اور تمہاری ہوا

اکھڑ جائے گی بلکہ ثابت قدم رہو۔" (سورۂ انفال - آیت ۴۶)

مسلمانوں میں باہمی نزاع اور نااتفاقی اسلامی معاشرے کی چولیں ہلا کر رکھ دیتی ہے اور اس کے رعب داب کو ملیا میٹ کر دیتی ہے۔ یہ ایمان ہی ہے جو ان کے مابین دوستی، محبت اور خلوص کی بنیاد ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

"تمام اہلِ ایمان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ وہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں۔" (سورۂ توبہ - آیت ۷۱)

مومنوں کا ایک دوسرے سے بڑا گہرا تعلق ہے اور اسی بنا پر وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے حالات میں گہری دلچسپی لیتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ خود اپنے حالات میں دلچسپی لیتے ہیں کیونکہ وہ سب ملکر ایک مربوط اکائی تشکیل دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اچھے کاموں کی تلقین کرتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں۔ یہ تلقین اور یہ مناہی کا جذبہ محبت ایمانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جملہ "یأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر" (وہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں) اس قول کے فوراً بعد آیا ہے جس میں مسلمانوں کے ولائے ایمانی کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرے لوگوں کی سرنوشت میں دلچسپی کا مآخذ دراصل خود ان لوگوں کی ذات میں دلچسپی ہوتا ہے۔ جس باپ کو اپنے بچوں میں دلچسپی ہو اس کے دماغ میں خود بخود ان کے مستقبل کے بارے میں فکر پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ عین ممکن ہے کہ اسے دوسروں کے بچوں میں کوئی دلچسپی نہ ہو اور اسی عدم دلچسپی کی بنا پر وہ ان کے بارے میں فکر مند بھی نہیں ہوتا اور اسی بنا پر ان کے اچھے یا برے اخلاق کی وجہ سے اس کے دماغ میں مثبت یا منفی احساسات پیدا ہونے کا

امکان نہیں ہوتا۔

اچھے کاموں کی تلقین کرنا اور برے کاموں سے روکنا انہی مثبت اور منفی احساسات کی پیداوار ہیں۔ یہ احساسات اُنس اور محبت کے بغیر وجود میں نہیں آتے۔

اگر ایک شخص کو کسی دوسرے شخص میں کوئی دلچسپی نہ ہو تو وہ اس کے اخلاق اور اطوار سے بے اعتنائی برتے گا لیکن اگر وہ اس میں دلچسپی رکھتا ہو تو یہ دلچسپی اسے لاپروا نہیں رہنے دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے نیکیوں کی تلقین اور بدیوں سے مناہی کو ولا کے عنوان کے تحت مربوط کر دیا ہے۔

پھر امر اور نہی کے نتیجے کے طور پر قرآن مجید نے دو چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتا ہے "وہ نماز پابندی سے پڑھتے ہیں اور زکات دیتے ہیں"۔ نماز خالق اور بندے کے درمیان تعلق کی آئینہ دار ہے اور زکات سے مسلمانوں کی اس باہمی محبت اور خیر خواہی کا اظہار ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور اس کے بعد قرآن مجید فرماتا ہے:

"یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ رحم فرمائے گا اور وہ خوشحال ہوں گے۔"

آئندہ صفحات میں ہم اس آیت کے بارے میں مزید وضاحت کریں گے اور بتائیں گے کہ اس آیت اور کئی مزید آیات میں قرآن نے جس 'عام مثبت ولا' کا ذکر کیا ہے اس کا مقصد فقط محبت اور دل لگاؤ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں پر باہمی خیر خواہی اور ہمدردی کے سلسلے میں ایک نوع کی ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔

ایک مشہور حدیث کے مطابق رسولِ اکرم ؐ نے فرمایا ہے کہ:

"باہمی محبت اور ہمدردی کے لحاظ سے مسلمان ایک زندہ جسم کی مانند ہیں۔ اگر جسم کے ایک عضو میں تکلیف ہو تو دوسرے اعضاء بھی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔"

حضرت ختمی مرتبت ؐ اور ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے آپ سے تربیت حاصل کی قرآن مجید فرماتا ہے:

"محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کیساتھ بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحم دل ہیں۔"

(سورۂ فتح ۔ آیت ۲۹)

یہ آیت عام مثبت اور منفی دونوں قسم کی ولا کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا قرآن مجید کی بہت سی آیات سے پتا چلتا ہے کہ اسلام کے دشمن ہمیشہ منفی ولا کو مثبت ولا میں اور مثبت ولا کو منفی ولا میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ اس کوشش میں رہے ہیں کہ مسلمانوں سے خود تو پرتپاک تعلقات استوار کریں لیکن خود مسلمانوں میں کسی نہ کسی بہانے پھوٹ ڈالیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ مسلمانوں میں فرقہ وارانہ تفرقات کو ہوا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود ہمارے دور میں غیر مسلموں نے اس بارے میں بے حد سرگرمی دکھائی ہے اور اپنے مقصد کے حصول کی خاطر بھاری رقوم صرف کی ہیں۔ بدقسمتی سے اپنی ان کوششوں کے نتیجے میں وہ مسلمانوں میں بعض ایسے عناصر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جن کا واحد مقصد مثبت ولا کو منفی ولا میں اور منفی ولا کو مثبت ولا میں تبدیل کرنا ہے۔ ان نابکاروں کی جانب سے رسولِ اکرم ؐ پر یہ سب سے بڑی ضرب ہے۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے جس سے عالمِ اسلام ان دنوں دوچار ہے۔

امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"واللہ یہ کتنے دکھ اور حیرت کی بات ہے کہ دشمن غلطی پر ہونے کے باوجود متحد ہیں اور تم حق پر ہوتے ہوئے منتشر ہو"

اے پروردگار! محمدؐ اور ان کی طاہر آل کے صدقے اسلام اور مسلمانوں کو ان نابکاروں کے شر سے محفوظ رکھ۔

□□□□□□□□□□□□□□

مثبت ولا کی خاص صورت

اہلِ بیتِ رسولؐ سے محبت رکھنا مثبت ولا کی خاص صورت ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ خود آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو تاکید فرمائی ہے کہ ان کے اہلِ بیت سے محبت رکھیں۔ علمائے اہلِ تسنّن بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے۔ یہی وہ ولائے خاص ہے جس کا ذکر اہل بیتؑ کے بارے میں نازل شدہ آیت ذوی القربیٰ میں کیا گیا ہے۔

حدیثِ غدیر ایک معروف اور مسلّمہ حدیث ہے جس کے مطابق آنحضرتؐ نے فرمایا:

"جو شخص مجھے اپنا مولا سمجھتا ہے اسے چاہیے کہ علی کو بھی اپنا مولا سمجھے۔"

اس حدیث میں بھی ایک قسم کی ولایت مضمر ہے جس کی تفصیل ہم بعد میں بیان کریں گے۔

شیعہ اور سنی دونوں مکاتب کے علماء اس پر متفق ہیں کہ آیت شریفہ:

"تمھارے ولی تو بس اللہ، اس کا رسولؐ اور وہ مومنین ہیں جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں۔" (سورۂ مائدہ۔ آیت ۵۵) امام علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

طبری نے اپنی تفسیر قرآن[1] میں اس بارے میں بہت سی روایات نقل کی ہیں۔

زمخشری جو ایک ممتاز سنی عالم ہے بڑے وثوق سے کہتا ہے:

"یہ آیت امام علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے گو یہ فقط ایک شخص سے منسوب ہے لیکن صیغہ جمع کا استعمال کیا گیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی امام علیؑ کی قائم کردہ مثال کے مطابق عمل کرنے کی ترغیب دلائی جائے اور یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ غریبوں اور بیکسوں کی مدد کرنے کے لیے نماز کو بھی تعویق میں ڈالا جا سکتا ہے۔"[2]

دوسرے الفاظ میں اگر ایسی صورت پیش آئے کہ نماز کی ادائیگی کے دوران زکات دینی پڑے تو محض نماز کی وجہ سے زکات کی ادائیگی کو التوا میں نہیں ڈالنا چاہیے۔

فخرالدین رازی اہل سنت والجماعت کے ایک اور معروف عالم ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ آیت امام علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور علماء کا اتفاق ہے کہ علیؑ کے سوا کسی نے حالتِ رکوع میں زکات ادا نہیں کی ہے۔"[3]

---

[1] تفسیر طبری جلد ۶ صفحہ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ [2] تفسیر کشاف جلد ۱۔ صفحہ ۵۰۵۔ مطبوعہ مصر ۱۳۷۳ھ۔ [3] تفسیر کبیر جلد ۱۲ صفحہ ۳۰۔ مطبوعہ مصر ۱۳۵۷ھ۔

زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ لفظ 'ولی' کے معنوں کے بارے میں اختلاف رائے ہو۔ ہم اس آیت کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے اس نکتے پر بحث کریں گے۔

علی ابن حماد عدوی بصری بغدادی جو چوتھی صدی ہجری کا ممتاز شیعہ شاعر گزرا ہے اس آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

فزن الالہ ولائہ بولائہ   حما تزکی وھو حان یرکع

سماہ رب العرش نفس محمد   یوم البھال وذالک مالا یدفع

"چونکہ امام علیؑ نے نماز پڑھتے ہوئے زکات ادا کی اس لیے اللہ نے امام کی ولا کو اپنی ولا کے ساتھ منسوب کر دیا ہے۔ مباہلہ کے وقت اللہ نے امام علیؑ کو محمدؐ کا نفس کہا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلانا ممکن نہیں۔"[1]

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اسلام نے تمام مسلمانوں کے ساتھ ایک عام قسم کی مثبت ولا کی سفارش کی ہے اور آیت شریفہ "تمام مومنین خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں ایک دوسرے کے ولی ہیں" اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہے لیکن جس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ "تمھارے ولی تو بس اللہ، اس کا رسول اور وہ مومنین ہیں جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں" عام مفہوم کی حامل نہیں ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس آیت کا اشارہ عام ولایت کی جانب ہے کیونکہ یہاں قرآن مجید کا مقصد ایک عام قاعدہ مرتب کرنا نہیں ہے۔ یہاں یہ کہنا مقصود نہیں کہ اصولی طور پر نماز کی حالت میں زکات دینا واجب ہے یا کم از کم پسندیدہ فعل ہے

---

[1] ریحانۃ الادب جلد ۵ صفحہ ۳۱۱

بلکہ ایک مخصوص فعل کا ذکر کرنا مقصود ہے جو ایک مخصوص شخص نے انجام دیا اور اس امر کی جانب اشارہ ہے کہ وہ شخص خاص ولایت کا مستحق ہے۔

ایک فرد واحد سے مربوط واقعہ کے لیے جمع کا صیغہ قرآن مجید میں اور مقامات پر بھی استعمال کیا گیا ہے مثلاً ارشاد ہوا ہے کہ:

"وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹ کر مدینہ پہنچے تو طاقتور لوگ ضرور کمزوروں کو نکال باہر کریں گے۔" (سورۃ منافقون۔ آیت ۸)

اس آیت میں گو "یقولون = وہ کہتے ہیں" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں لیکن اس واقعہ کا تعلق فقط ایک شخص یعنی عبداللہ ابن ابی سے تھا اور اسی نے یہ الفاظ کہے تھے۔

موجودہ دور کی بامحاورہ زبان میں بھی بعض اوقات ہم کہتے ہیں کہ "وہ یوں کہتے ہیں" حالانکہ ہم اس بات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ جو قول نقل کیا جارہا ہے وہ فقط ایک شخص کا ہے۔

نماز پڑھتے ہوئے زکات ادا کرنا کوئی عام واقعہ نہیں لہٰذا یہ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ جو لوگ یہ فعل بجالائیں اللہ ان سب کی تعریف کرتا ہے۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت کے اطلاق کی نوعیت مخصوص اور ذاتی ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک ایسا شخص ہے جو اللہ کی عبادت کرتے ہوئے بھی اپنے ہم جنسوں کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ اسی سلسلے میں قرآن مجید فرماتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرح وہ شخص بھی مومنین کا ولی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس 'ولا' سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ فقط ایک خاص محبت اور ارادت ہے جو لوگوں کو امام علیؑ سے رکھنی چاہیے

یا اس سے بالاتر چیز ہے ؟ اس موضوع پر ہم اگلے صفحات میں بحث کرینگے۔
فی الحال ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اہل سنت کے بعض علماء کے خیال کے برعکس
یہ آیت عام ولا پر نہیں بلکہ خاص ولا پر دلالت کرتی ہے۔

□□□□□□□□□□□□□□

خاص مثبت ولا کی اقسام

یہ تو ہم ملاحظہ کر چکے ہیں کہ امام علی علیہ السلام اور اہل بیتؑ کے دوسرے افراد سے محبت کا لزوم ایک مسلمہ امر ہے۔ اب فقط ایک نکتہ قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ اس محبت کی صحیح نوعیت کیا ہے؟ اس نکتے کی وضاحت کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ولا اور ولایت کے الفاظ (جن کا ترجمہ ہم نے 'محبت' کیا ہے) اہل بیتؑ کے متعلق قرآن اور سنت میں کس سیاق و سباق میں استعمال ہوئے ہیں بالعموم یہ الفاظ چار مختلف معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔

ولائے قرابت

مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اہلِ بیتؑ کا اس سے کہیں زیادہ احترام کریں اور ان سے اس سے کہیں زیادہ محبت کریں جتنا کہ عام ولا کا تقاضا ہے۔ قرآن مجید کی کئی ایک آیات اور رسولِ اکرمؐ کی ان بہت سی احادیث

سے جو شیعہ اور سنی ماخذ سے ہم تک پہنچی ہیں یہ پتا چلتا ہے کہ امام علی علیہ السلام سمیت اہل بیتؑ سے محبت اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔ اس سلسلے میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

پہلا سوال یہ ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ تمام لوگوں سے کہا گیا ہے کہ اہلِ بیتؑ کا احترام کریں اور ان سے محبت کریں اور اس محبت کو اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ کیوں قرار دیا گیا ہے؟ بالفرض اگر تمام لوگ اہل بیتؑ کی معرفت حاصل کرلیں اور ان سے محبت کرنے لگیں تو اس کا عملی فائدہ کیا ہوگا؟ جیسا کہ ہم جانتے ہیں تمام اسلامی تعلیمات کی بنیاد کسی نہ کسی حکمت اور فلسفے پر ہے۔ اگر اہل بیتؑ سے محبت اسلام کے بنیادی احکام میں سے ہے تو اس حکم کے پیچھے کوئی فلسفہ بھی کارفرما ہوگا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اہلِ بیتؑ سے محبت کی تلقین واقعی ایک فلسفے کی حامل ہے۔ یہ نہ تو کوئی فضول مطالبہ ہے اور نہ ہی رسولِ اکرمؐ یا اہل بیتؑ کے فائدے کے لیے ہے۔ قرآن مجید نے آنحضرتؐ کی زبانی بالصراحت کہا ہے کہ جو صلہ میں نے تم سے مانگا ہے (یعنی اہل بیتؑ سے محبت) اس کا فائدہ خود تمھیں (یعنی مومنین کو) پہنچتا ہے۔

یہ محبت اسلام کی مقرر کردہ ولا کی تمام دوسری قسموں کی تمہید ہے جن کی وضاحت بعد میں کی جائے گی۔ یہ لوگوں کو خاندانِ رسالت سے وابستہ رکھتی ہے اور انہیں ان کی تعلیمات، سیرت اور کردار سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

ہم نے اپنی کتاب 'جاذبہ و دافعہ علی علیہ السلام'[1] میں کردار سازی پر

---

[1] اس کتاب کا اردو ترجمہ "جامعہ تعلیمات اسلامی" عنقریب شائع کر رہی ہے۔

محبت اور بالخصوص اولیائے حق سے محبت کے اثرات کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے لہٰذا جو کچھ اس کتاب میں کہا گیا ہے اس کی تکرار یہاں ضروری نہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اہل بیتؑ کی محبت اہلِ تشیّع کا خاصہ ہے یا تمام مسلمان اس پر ایمان رکھتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ محبت اہل بیتؑ شیعوں سے مخصوص نہیں ہے اور تمام اسلامی فرقے اسے اہمیت دیتے ہیں۔ امام شافعی نے جو اہل سنت کے ائمہ اربعہ میں سے ایک ہیں اپنے معروف اشعار میں یوں کہا ہے:

"ہر شخص کو جان لینا چاہیے کہ اگر آلِ محمدؐ سے محبت کرنے سے انسان رافضی ہو جاتا ہے تو جن اور انسان گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔" [۱]

امام شافعی یہ بھی کہتے ہیں کہ:

"اے اہل بیتِ رسولؐ! اللہ نے قرآن میں آپ سے محبت واجب قرار دی ہے۔ یہ بات آپ کے لیے باعثِ فخر ہے کہ جب تک آپ پر درود نہ بھیجا جائے نماز صحیح نہیں ہوتی۔" [۲]

وہ مزید کہتے ہیں کہ:

"لوگوں نے مختلف راستے اختیار کیے ہیں جس کی وجہ سے وہ گمراہ ہو گئے ہیں۔ میں اللہ کا نام لے کر ایک ایسی کشتی میں سوار ہو گیا ہوں جو مجھے صحیح و سالم کنارے پر لگا دے گی۔ وہ کشتی اہلبیت رسولؐ

۱۔ تفسیر کبیر فخر الدین رازی۔ جلد ۲۷ (صفحہ ۱۶۶)

۲۔ الکنیٰ والالقاب۔ محدث قمی اور نور الابصار شبلنجی (صفحہ ۱۰۴)

ہیں۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لیں۔ وہ رسّی ان (اہل بیت) کی ولا ہے اور میں نے اسے مضبوطی سے تھام لیا ہے۔"[1]

زمخشری اور فخر الدین رازی نے جو خلافت کے مسئلے پر شیعوں کی شدید مخالفت کرتے ہیں اپنی تفاسیر قرآن میں آنحضرتؐ سے حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"جو شخص اس حالت میں مرے کہ آل محمدؐ سے محبت رکھتا ہو وہ شہید کی موت مرتا ہے، جو شخص اس حالت میں مرے کہ آلِ محمدؐ سے محبت رکھتا ہو وہ مغفور کی موت مرتا ہے، جو شخص اس حالت میں مرے کہ آلِ محمدؐ سے محبت رکھتا ہو وہ تائب کی موت مرتا ہے، جو شخص اس حالت میں مرے کہ آلِ محمدؐ سے محبت رکھتا ہو وہ مومن اور کامل الایمان شخص کی موت مرتا ہے۔"[2]

---

[1] الکنیٰ والالقاب۔ محدث قمی)

[2] تفسیر کبیر فخر الدین رازی (جلد ۲۷۔ صفحہ ۱۶۶) اور کشاف زمخشری (جلد ۴) سورۂ شوریٰ کی ۳۲ ویں آیت کی تفسیر

امام علی علیہ السلام نے بھی نہج البلاغہ کے ۱۸۸ ویں خطبہ میں فرمایا ہے:

"جو شخص اپنے بستر پر مرے لیکن اللہ، اس کے رسولؐ اور اہل بیتؑ کے حقوق پہچانتا ہو وہ ایسا ہی ہے جیسے کہ میدان جنگ میں شہید ہوا ہو۔ اسے اسکی نیک نیتی کی جزا دی جائیگی اور یوں سمجھا جائے گا جیسے کہ اس نے شمشیر بکف جنگ لڑی ہو۔"

مصر کا مشہور عارف اور غزل گو شاعر ابن فارضؔ — جسے عربی ادبیات میں وہی رتبہ حاصل ہے جو فارسی زبان میں خواجہ حافظ کا ہے — اپنی ایک معروف غزل میں اللہ تعالےٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے :

"اے پروردگار! اگر میں تیری خوشنودی حاصل نہ کر سکوں تو میری زندگی بے مصرف اور بیکار گزرے گی ۔ اب (تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے) میرے پاس ایک چیز کے سوا اور کچھ نہیں اور وہ چیز ولا کا وہ پیوند ہے جو میں نے قصّی کی اولاد میں سے مبعوث ہونے والے سچے پیغمبرؐ کے اہل بیت سے جوڑ رکھا ہے۔"

ممکن ہے کہ لفظ 'ولا' سے ابن فارضؔ کی مراد کوئی زیادہ بلند معنی ہوں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے یہ لفظ ولائے قرابت کے لیے استعمال کیا ہے۔

عبدالرحمٰن جامیؔ نے فرزدقؔ کے اس معروف قصیدے کا منظوم فارسی ترجمہ کیا ہے جو اس نے حضرت سجّاد علیہ السلام کی مدح میں پڑھا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ فرزدقؔ کی وفات کے بعد کسی نے اسے خواب میں دیکھا اور دریافت کیا کہ اللہ نے تجھ سے کیا سلوک کیا؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے جو قصیدہ حضرت علی بن حسین علیہم السلام کی مدح میں کہا تھا اس کی بنا پر اللہ نے میرے گناہ معاف کر دیے۔

جامیؔ خود اس روایت پر اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو اس قصیدے کی خاطر بخش دے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔

ہشامؔ بن عبدالملک نے مذکورہ قصیدے کی بنا پر فرزدقؔ کو قید کر دیا اور شکنجے میں کسا۔ جامیؔ اس سلسلے میں کہتا ہے :

"اگر ہشام کی آنکھ سچائی کو دیکھ سکتی اور وہ ایک نیک کردار اور
با ایمان شخص ہوتا تو فرزدق پر ظلم نہ ڈھاتا اور قید کرنے کی بجائے
اسے خلعت دیتا۔" [1]

پس اہلِ تشیع اور اہلِ تسنن میں ولائے عترتِ پیغمبرؐ کے بارے میں کوئی
اختلاف نہیں۔ صرف ناصبی اہلِ بیتِ رسولؐ سے بغض رکھتے ہیں پوری ملتِ اسلامیہ
انھیں مردود و مطرود سمجھتی ہے اور کفار کی طرح نجس گردانتی ہے۔ اللہ کا شکر
ہے کہ موجودہ دور میں دنیا ان کے وجود کی نجاست سے پاک ہوگئی ہے۔ کبھی کبھی
معدودے چند افراد ان میں سے دیکھنے میں آتے ہیں جو کبھی کبھار کتابیں لکھتے ہیں۔
ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں نااتفاقی پیدا کریں۔ اسی قسم کے کچھ
لوگ خود ہمارے اپنے درمیان بھی پائے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ
مسلمانوں میں نااتفاقی پھیلائیں وہ خواہ اپنے آپ کو شیعہ کہیں یا سنی ـــــ سب
کے سب استعمار کے آلۂ کار ہیں۔

زمخشری اور رازی رسولِ اکرمؐ کی مذکورہ بالا حدیث نقل کرنے کے
فوراً بعد آنحضرتؐ کی ایک اور حدیث نقل کرتے ہیں جس کی عبارت یہ ہے:

"جو شخص اس حالت میں مرے کہ اہل بیتِ رسولؐ کے لیے
دشمنی رکھتا ہو وہ کافر مرتا ہے اور بہشت کی بو تک بھی نہیں
سونگھے گا۔"

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"اللہ نے کوئی چیز کتے سے زیادہ نجس پیدا نہیں کی لیکن جو شخص

---

[1] سلسلۃ الذہب

ہم اہل بیتؑ سے دشمنی رکھے وہ کتے سے بھی زیادہ نجس ہے۔"[1]

اگر اس قسم کی ولا کو اہل بیت سے نسبت دی جائے اور انہیں "صاحب ولا" کہا جائے تو یہ ولائے قرابت کہلائے گی اور اگر اسے اس ذمہ داری کے پیشِ نظر جو ان پر اہل بیتؑ سے محبت کے بارے میں عائد ہوتی ہے مسلمانوں سے نسبت دی جائے تو پھر اسے ولائے محبت کہیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لفظ "ولا" کا مادہ اور اس کے مشتقات محبت کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں بالخصوص زیارات میں "موالِ" کا لفظ دوست کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "موال لمن والاکم و معاد لمن اعداکم" جس کا مطلب بلاشبہ یہ ہے کہ میں ان لوگوں کا دوست ہوں جو آپ سے محبت کرتے ہیں اور ان لوگوں کا دشمن ہوں جو آپ کے دشمن ہیں۔

دو اور نکات بحث طلب ہیں۔ ایک یہ کہ آیا لفظ "ولی" بالخصوص دوست کے معنی میں استعمال ہوا ہے یا نہیں اور دوسرا یہ کہ لفظ "ولی" بالخصوص آیت کریمہ انما ولیکم اللہ میں جو امیر المومنین علیہ السلام کی ولایت ثابت کرتی ہے کن معنوں میں استعمال ہوا ہے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ "ولا" قرآن مجید میں ہمیشہ دوست کے معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن اگر اس کے استعمال پر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس کے معنی مختلف ہیں۔ مثلاً اس آیت:

اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور

(سورۃ بقرہ۔ آیت ۲۵۷)

---

[1] وسائل الشیعہ۔ جلد ا۔ صفحہ ۱۵۹۔ نیا ایڈیشن

کے یہ معنی نہیں کہ اللہ اہلِ ایمان کا دوست ہے بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ اپنی خاص عنایت اور تصرف سے اہلِ ایمان کا خیال رکھتا ہے اور وہ اس کی حمایت سے بہرہ مند ہوتے ہیں یا مثلاً اس آیت :

الا ان اولیاء اللّٰہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون (سورۂ یونس آیت ۶۲)

کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ کے دوستوں کو کسی چیز کا خوف نہیں۔ یہاں لفظ "ولی" فعیل کے زمرے میں آتا ہے اور مفعول کے معنوں میں ہے لہٰذا آیت مبارک کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ جن لوگوں کی حفاظت کرتا ہے انہیں کسی چیز کا خوف نہیں۔ یہی صورت مندرجہ ذیل آیت کی ہے :

المومنون والمؤمنات بعضھم اولیاء بعض (سورۂ توبہ۔ آیت ۷۱)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ مومنین ایک دوسرے کے دوست ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی حفاظت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے مقدر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر اس سے اگلی آیت میں کہا گیا ہے :

یأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر

اس بیان سے سوال کے دوسرے حصے کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ زیرِ غور آیت کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ، رسولِ اکرمؐ اور امام علی علیہ السلام مومنین کے دوست ہیں بلکہ یہ کہنا مقصود ہے کہ وہ مسلمانوں کے معاملات میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور اگر فرض کر لیا جائے کہ "دوست" کے معنوں میں لفظ "ولی" کا استعمال صحیح ہے تب بھی یہ معنی اس آیت کے سیاق و سباق سے مطابقت نہیں رکھتے کیونکہ یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ فقط اللہ، رسولِ اکرمؐ اور امام علیؑ مسلمانوں کے دوست ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ بعض سنی مفسرین کا یہ کہنا غلط ہے کہ اس آیت کا مفہوم کچھ زیادہ اہم نہیں بلکہ فقط یہ ہے کہ امام علی علیہ السلام مومنین

کے دوست ہیں یا یہ کہ وہ امام علیؑ کو دوست رکھیں اور ان سے محبت کریں۔ دراصل آیتِ ولایت میں ولی کا لفظ محض محبت کے معنوں میں نہیں بلکہ اس سے بلند تر معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس نکتے کی وضاحت آئندہ صفحات میں کی جائے گی۔

□□□□□□□□□□□□□□

ولائے امامت

ولائے امامت یا بالفاظ دیگر مرجعیتِ دینی وہ منصب ہے جو امام کو ان دوسرے لوگوں کے لیے بطورِ نمونہ پیش کرتا ہے جنہیں اس کی پیروی کرنا ہوتی ہے اور اس سے ہدایات لینی ہوتی ہیں۔ یہ منصب خود بخود امام کی عصمت پر دلالت کرتا ہے۔ یہ وہی منصب ہے جس کے متعلق قرآن مجید رسولِ اکرمؐ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"رسولؐ اللہ کی سیرت تم میں سے ان لوگوں کیلئے بہترین نمونہ ہے جو اللہ اور روزِ آخرت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔" (سورۂ احزاب۔ آیت ۲۱)

"اے رسول! ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ پھر اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔" (سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۳۱)

قرآن مجید کی یہ آیات رسولِ اکرمؐ کو بطورِ نمونہ پیش کرتی ہیں تاکہ لوگ ان کی پیروی کریں اور اپنا کردار ان کے کردار کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ یہ چیز بجائے خود آنحضرتؐ کی عصمت کا ثبوت ہے کیونکہ جس شخص سے غلطی اور گناہ سرزد ہونے کا امکان ہو خدا تعالےٰ اسے پیشوا کے طور پر متعارف نہیں کراتا۔

رسولِ اکرمؐ کے بعد یہ منصب اہل بیتؑ کو حاصل ہوا۔[1] بہت سے سنی علماء نے اپنی حدیث، تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں تقریباً بتیس صحابہ کے حوالے سے آنحضرتؐ کی ایک حدیث نقل کی ہے جس کے مطابق آپ نے فرمایا ہے:

"میں تمہارے درمیان دو بیش قیمت چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میرے اہل بیت۔ وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے حتیٰ کہ حوضِ کوثر پر مجھ سے آملیں۔ اگر تم ان سے آگے بڑھو گے یا ان سے پیچھے رہ جاؤ گے تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ انہیں پڑھانے کی کوشش نہ کرو کیونکہ وہ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔"

یہاں رسولِ اکرمؐ نے اہل بیتؑ کو اللہ کی کتاب کا ساتھی اور ہم پلہ قرار دیا ہے اور اللہ تعالےٰ اپنی کتاب کے بارے میں فرماتا ہے:

"باطل نہ تو اس کے آگے سے پھٹک سکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔"

(سورۂ فصلت۔ آیت ۴۲)

اب اگر باطل اہلبیتؑ کے قریب پھٹک سکتا ہے تو وہ قرآنِ مجید کے ہم پلہ

---

[1] اس موضوع پر علامہ محقق مرتضیٰ عسکری کی کتاب "احیائے دین میں ائمۂ اہلبیت علیہم السلام کا کردار دیکھیے۔"

کیونکر قرار پاتے؟ اسی طرح اگر وہ معصوم نہ ہوتے تو امّتِ مسلمہ کی پیشوائی کے لیے رسول اکرمؐ کے جانشین نہیں قرار پا سکتے تھے۔ حدیث کے مندرجات سے واضح ہے کہ اس کے مصداق چند معصوم اشخاص ہیں۔ جیسا کہ خواجہ نصیرالدین طوسی نے کہا ہے اہل بیتؑ کے علاوہ نہ کوئی معصوم ہے اور نہ ہی کسی دوسرے شخص کے معصوم ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے لہٰذا اس حدیث کا اطلاق فقط ائمہؑ اہل بیتؑ پر ہوتا ہے۔

ابنِ حجر عسقلانی ہیثمی کہتا ہے:

رسولِ اکرمؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ اگر وہ اہل بیتؑ سے آگے بڑھیں گے یا ان سے پیچھے رہ جائیں گے تو ہلاک ہو جائیں گے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ لوگوں کو چاہیے کہ انہیں پڑھائیں نہیں کیونکہ وہ دوسروں سے بہتر جانتے ہیں۔ رسولِ اکرمؐ کا یہ ارشاد اس امر کی دلیل ہے کہ اہل بیتؑ ہیں جو لوگ اعلےٰ علمی مراتب پر پہنچے اور دینی پیشوائی کے اہل تھے وہ دوسروں سے برتر تھے۔[1]

حافظ ابو نعیم نے ابنِ عباس سے روایت کی ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا کہ جو شخص میری طرح جینا اور میری طرح مرنا چاہے اسے چاہیے کہ میرے بعد علیؑ کو اپنا ولی منتخب کرے اور میرے خاندان سے تعلق رکھنے والے اماموں کی پیروی کرے کیونکہ انہیں فہم و دانش سے نوازا گیا ہے۔ وہ لوگ بڑے بدنصیب ہیں جو اُن کی فضیلت سے انکار کرتے ہیں اور میری ان سے رشتہ داری کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے کیونکہ انہیں میری شفاعت میسّر نہ ہوگی۔[2]

ایسی دینی پیشوائی جو پیشوا کے ہر قول اور فعل کو مستند اور حجّتِ الٰہی قرار دے

---

[1] الصواعق المحرقہ (صفحہ ۱۳۵) [2] حلیۃ الاولیاء (جلد ۱ صفحہ ۸۶)

امامت کہلاتی ہے۔ یہ ان معنوں میں ایک قسم کی ولایت ہے کہ اس میں لوگوں کے معاملات میں تسلّط، تدبّر اور تصرّف کا حق مضمر ہے۔

عام قاعدے کے مطابق ہر معلم اور مربی اپنے شاگردوں اور زیرِ تربیت لوگوں پر اختیار رکھتا ہے اور یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ جو معلم اللہ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہو اس کے اختیارات زیادہ ہونے چاہئیں۔ آیت شریفہ:

"تمہارے ولی تو بس اللہ اور اس کا رسولؐ اور وہ مومنین ہیں جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں۔" (سورۂ مائدہ۔ آیت ۵۵)

اسی قسم کی ولایت سے مناسبت رکھتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ آیت ولایت کی بعض دوسری اقسام پر حاوی نہیں جن کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ آیت امامت پر بھی محیط ہے۔ رسولِ اکرمؐ کی کئی ایک احادیث میں بھی 'ولی' کا لفظ 'امام' کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اس قسم کی ولا کا ذکر جب امام کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کیا جائے تو اس سے مراد دینی اختیار اور پیشوائی کا حق ہے اور اگر اسے مسلمانوں سے نسبت دی جائے تو اس کا مطلب اس حق کو تسلیم کرنا ہے۔

□□□□□□□□□□□□□□

ولائے زعامت

ولائے زعامت کے معنی سماجی اور سیاسی پیشوائی کے حق کے ہیں۔ بلاشبہ ہر معاشرے کو ایک پیشوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو شخص مملکت کے امور کی ذمہ داری سنبھالے اور لوگوں کے مقدر پر مسلط ہو اسے ولی الامر المسلمین کہا جاتا ہے۔ اپنی زندگی میں رسولِ اکرمؐ اس عہدے کے حامل تھے اور یہ انہیں اللہ تعالےٰ نے تفویض کیا تھا۔ ان کے وصال کے بعد یہ حیثیت اہلِ بیتؑ کو حاصل ہوئی۔ اس قول کو ثابت کرنے کیلئے ناقابلِ تردید شواہد موجود ہیں۔ حدیثِ غدیر کے علاوہ بہت سی قرآنی آیات بھی اس قسم کی ولایت کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔

"اے ایمان والو! خدا کی اور رسولؐ کی اور ان لوگوں کی
اطاعت کرو جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔"

(سورۂ نساء۔ آیت ۵۹)

"نبیؐ مومنین پر خود ان کی جانوں سے بھی زیادہ تصرف

کا حق رکھتے ہیں۔" (سورۂ احزاب - آیت ۶)

اس بارے میں کوئی اختلافِ رائے نہیں کہ رسولِ اکرمؐ اس رتبے کے حامل ہیں اور یہ ایک الٰہی شان یعنی ایسا حق ہے جو بندوں نے نہیں بلکہ خدا نے آپ کو عنایت کیا ہے۔ ہمارے سنی بھائی بھی اس مسئلے پر ہم سے متفق ہیں۔ جو سوال بحث طلب ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کون اس رتبے پر فائز ہے۔ انتشار اور افراتفری سے محفوظ رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا شخص موجود ہو جو مسلمانوں کے امور کا انتظام چلائے اور وہ اس کی اطاعت کریں۔ کیا اسلام نے اس بارے میں کوئی طریقِ کار وضع کیا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو وہ طریقِ کار کیا ہے؟ کیا لوگوں کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ رسولِ اکرمؐ کے بعد جسے جی چاہے منتخب کر لیں اور دوسروں پر اس کی اطاعت واجب ہو یا یہ کہ آنحضرتؐ نے ایک مخصوص شخص کو اپنا جانشین نامزد کر دیا؟

اس سلسلے میں ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن مجید کے مطابق رسولِ اکرمؐ نے اپنی امت کے معاشرتی معاملات کے متعلق کیا کام انجام دیے؟ اور آپ کو امت پر کون کون سے اجتماعی اختیارات حاصل تھے؟

قرآن سے اور حضورؐ کی سیرت اور سنت سے پتا چلتا ہے کہ آپ بیک وقت تین عہدوں کے حامل تھے:

اوّلاً یہ کہ آپ امام اور رہبر اور مرجع دینی کی حیثیت رکھتے تھے اور امامت کے حامل تھے۔ آپ جو کچھ کہتے یا کرتے وہ حجت ہوتا تھا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

"رسول تمھیں جس بات کا حکم دیں مان لو اور جس بات

سے روکیں، رک جاؤ۔" (سورۂ حشر۔ آیت ۷)

ثانیاً یہ کہ آپ ولایت قضائی کے عہدے پر فائز تھے یعنی یہ کہ اندرونی جھگڑوں اور مقدموں کے بارے میں آپ کے فیصلے قطعی ہوتے تھے اور ہر ایک پر ان کی پابندی لازمی تھی۔

"اے رسولؐ! تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچّے مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تمہیں اپنا حکم نہ بنائیں۔ پھر جو فیصلہ تم کرو اس سے ان کے دل ملول نہ ہوں بلکہ وہ اسے بے چون و چرا تسلیم کرلیں۔" (سورۂ نساء۔ آیت ۶۵)

گو ولایت کے لفظ کا ان معنوں میں استعمال درست ہے لیکن عملی طور پر اس کا قانونی اصطلاح کی شکل میں استعمال ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

ثالثاً یہ کہ آپ سیاسی اور سماجی ولایت کے حامل تھے۔ احکامِ الٰہی کی تبلیغ اور تشریح کرنے اور مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے علاوہ آپ مسلمانوں کے معاشرتی اور سیاسی معاملات کا اہتمام بھی فرماتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے ولی الامر تھے۔ مندرجہ ذیل آیات آپکے اختیارات کے اس پہلو کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔

"اے ایمان والو! خدا کی اور رسولؐ کی اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے ولی الامر ہوں۔" (سورۂ نساء۔ آیت ۵۹)

"نبی مومنوں پر خود ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق تصرف رکھتے ہیں۔" (سورۂ احزاب۔ آیت ۶)

رسولِ اکرمؐ کا ایک چوتھا عہدہ بھی تھا جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

رسولِ اکرمؐ لوگوں پر حکومت کرتے تھے اور سیاسی اور سماجی معاملات میں ان کی رہنمائی فرماتے تھے۔ آیت کریمہ:

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّیۡهِمۡ ۝[1]

بتاتی ہے کہ آپ لوگوں سے ٹیکس وصول کرتے تھے اور ان کے مالی اور اقتصادی معاملات کا اہتمام کرتے تھے اور رسولِ اکرمؐ کی یہی حیثیت ہے جو خلافت کے مسئلے کی بنیاد ہے۔

یہاں اس نکتے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ جہاں امام کا لفظ ان مذہبی پیشواؤں اور رہنماؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن سے علم دین حاصل کیا جائے (اور اہلِ سنت انہی معنوں میں ابوحنیفہ، شافعی، مالک اور احمد بن حنبل کے لیے امام کا لفظ استعمال کرتے ہیں) وہاں یہ لفظ سیاسی اور سماجی پیشواؤں کے لیے بھی بکثرت استعمال ہوا ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

مسلمانوں کا دل تین چیزوں کے بارے میں خیانت اور شک گوارا نہیں کر سکتا:

۱۔ اللہ تعالےٰ کے لیے خلوصِ نیّت

۲۔ مسلمانوں کی رہنمائی کے سلسلے میں مسلمان پیشواؤں کے لیے خیر خواہی

۳۔ مسلمانوں کی جماعت کی بے لوث مدد[2]

اپنے ایک خط[3] میں جو نہج البلاغہ میں موجود ہے امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"قوم کو دھوکا دینا سب سے بڑی خیانت ہے اور اماموں

---

[1] سورۂ توبہ۔ آیت ۱۰۳ [2] کافی جلد ۱۔ صفحہ ۴۰۳۔ [3] خط نمبر ۲۶

سے دغا کرنا بدترین دغا بازی ہے۔"

یہ امر بدیہی ہے کہ اماموں سے دغا کرنے کے معنی تمام مسلمانوں سے دغا کرنے کے ہیں۔ اگر کوئی شخص جہاز کے کپتان کو دھوکا دے کر جہاز کو خطرے میں ڈال دیتا ہے تو در اصل وہ جہاز میں سوار تمام لوگوں کو دھوکا دیتا ہے۔

جیسا کہ ظاہر ہے کہ امام علی علیہ السلام کے مذکورہ خط میں امام کا لفظ سماجی اور سیاسی لیڈر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

تاریخ اسلام پر لکھی گئی کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ مسلمان — حتیٰ کہ ائمۂ اہل بیت علیہم السلام بھی — اپنے ہم عصر خلفاء کو امام کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس سلسلے میں یاد رکھنا چاہیے کہ ان معنوں میں امام عادل بھی ہو سکتا ہے اور ظالم بھی اور دونوں کے بارے میں مسلمانوں پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

ایک معروف حدیث کے مطابق جسے سنی اور شیعہ دونوں صحیح تسلیم کرتے ہیں رسول اکرمؐ نے فرمایا:

اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ اِمَامٍ جَائِرٍ یعنی "سب سے بڑا جہاد ایک ظالم امام کے سامنے سچی بات کہہ دینا ہے۔"

ایک اور حدیث کے مطابق آنحضرتؐ نے فرمایا:

آفَةُ الدِّيْنِ ثَلَاثَةٌ: اِمَامٌ جَائِرٌ وَّ مُجْتَهِدٌ جَاهِلٌ وَّ عَالِمٌ فَاجِرٌ یعنی "تین اشخاص دین کو نقصان پہنچاتے ہیں: ظالم لیڈر، نادان عابد اور بدکردار عالم۔"

علاوہ ازیں خود قرآن مجید ایسے اماموں کا ذکر کرتا ہے جو دوزخ کی جانب دعوت دیتے ہیں:

"ہم نے انہیں ایسے امام قرار دیا ہے جو دوزخ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔" (سورۂ قصص ۔ آیت ۴۱)

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ لفظ 'امام' عموماً عادل اور راستباز پیشواؤں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اہل تشیّع کی اصطلاح میں یہ لفظ فقط معصوم اور برحق پیشواؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کی تعداد بارہ ہے۔

□□□□□□□□□□□□□□

ولائے تصرّف

ولائے تصرف یا ولائے معنوی ولایت کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ ولایت کی تمام دوسری اقسام سے اہل بیت کا تعلق یا تو ان کی ذاتی طہارت و قداست کے علاوہ رسولِ اکرمؐ سے قرابت کی بنا پر ہے اور یا ان کی اپنی علمی اور اجتماعی صلاحیتوں کی وجہ سے ہے۔ تاہم ان دونوں صورتوں میں یہ ولایت قانونی اور رسمی حدود سے تجاوز نہیں کرتی لیکن ولایتِ تصرف یا ولایت معنوی ایک قسم کی غیر معمولی اور خدا داد قوت اور اغنیار پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ اس ولایت پر اعتقاد رکھتے ہیں ان کی نظر میں اس کا کیا مفہوم اور کیا اہمیت ہے۔

ولایتِ تکوینی کا تعلق ایک طرف تو حصولِ کمال کی ان صلاحیتوں سے ہے جو انسان میں پوشیدہ ہیں اور دوسری طرف اس رابطے سے ہے جو انسان اور اللہ کے درمیان موجود ہے۔ ولایت تکوینی کا مطلب یہ ہے کہ بندگی کی راہ پر

چلتے چلتے انسان قربِ الٰہی کا مقام حاصل کر لیتا ہے اور قرب کے اعلیٰ مدارج پر پہنچنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی روحانیت جو بجائے خود ایک حقیقت ہے اس کے اندر سمٹ جاتی ہے۔ وہ روحانیت کے قافلے کا سالار، لوگوں کے ضمیر کا حاکم، ان کے افعال کا شاہد اور اپنے دور کے لیے حجت بن جاتا ہے۔ دنیا کبھی ایسے روحانی پیشوا سے خالی نہیں رہی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک انسانِ کامل دنیا میں موجود نہ رہا ہو۔

ان معنوں میں ولایت نبوّت، خلافت، وصایت اور دینی احکام میں مرجعیت کے مفہوم میں امامت سے مختلف چیز ہے۔ اس کا نبوّت، خلافت اور وصایت سے مختلف ہونا حقیقی ہے لیکن امامت سے مختلف ہونا محض تصوراتی اور برائے نام ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ولایت کا نبوّت، خلافت اور وصایت سے مختلف ہونا حقیقی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک نبی یا اس کا وصی یا جانشین ولی نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ نبوّت اور اسی طرح خلافت اور وصایت کی ماہیت ولایت سے مختلف ہے ورنہ اولوالعزم انبیاء اور بالخصوص حضرت خاتم النبیینؐ مکمل ولایت کے حامل رہے ہیں۔

جب ہم کہتے ہیں کہ ولایت کا امامت سے مختلف ہونا محض تصوّراتی ہے تو اس سے ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسا مقام ہے جو ایک لحاظ سے امامت اور ایک لحاظ سے ولایت کہلاتا ہے۔ اسلامی اصطلاح میں لفظ 'امامت' اکثر ولایت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے وسیع معنوں میں امامت پیشوائی کو کہا جاتا ہے۔ ایک دینی قائد، ایک سیاسی اور سماجی لیڈر اور ایک روحانی پیشوا سبھی امام کہلاتے ہیں۔

شیعہ نقطۂ نگاہ سے ولایت کے تین رخ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے لیے لفظ "امامت" استعمال ہوا ہے۔

اس کا پہلا رخ سیاسی ہے۔ سوال یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ کا جانشین اور مسلمانوں کا سیاسی اور سماجی قائد بننے کے لیے کون شخص سب سے زیادہ موزوں اور قابل تھا۔ حضرت رسولِ اکرمؐ نے خود اس عہدے پر امام علی علیہ السلام کا تقرر حکم خدا سے کیا تھا۔ تاہم موجودہ زمانے میں اس مسئلے کی اہمیت عملی نہیں بلکہ محض اعتقادی اور تاریخی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کے بعد وہ کون اشخاص ہیں جن سے دینی مسائل کے بارے میں رجوع کیا جائے اور وہ اشخاص کس ذریعے سے علم حاصل کرتے ہیں اور کیا وہ فیصلہ دینے میں معصوم ہیں یا نہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ائمۂ اثنا عشر معصوم ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے اعتقادی اور عملی دونوں پہلو ہیں۔

ولایت کا تیسرا رخ معنوی اور باطنی ہے۔ شیعوں کے عقیدے کے مطابق ہر دور میں ایک ایسا انسانِ کامل گزرا ہے جسے دنیا اور انسانوں پر تکوینی تسلّط حاصل رہا ہے اور جس نے دلوں اور روحوں کو قابو میں رکھا ہے اور اس اعتبار سے اس کا نام "حجت" ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کچھ بعید نہیں کہ قرآن مجید کی آیت مبارکہ "نبیؐ مومنین پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ حقِ تصرف رکھتے ہیں"۔ کا اشارہ ولایت کے انہی معنوں کی طرف ہو۔

ولایتِ تصرف یا ولایتِ تکوینی کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی بھی انسان کائنات کا کاروبار چلانے یا اللہ تعالٰے کے نمائندے کے طور پر پیدا کرنے، روزی دینے، زندگی بخشنے اور مار ڈالنے کے فرائض انجام دینے کی قوت حاصل کر سکتا ہے۔

اللہ تعالٰے نے کائنات کا نظام علّت اور معلول کے اصول کی بنیاد پر

ترتیب دیا ہے۔ گو ان موجودات کو جنہیں قرآن مجید "ملائکہ" کہتا ہے بہ اذنِ خدا "مدبراتِ امر" (سورۂ نازعات آیت ۵) اور "مقسمات امر" (سورۂ ذاریات آیت ۴) کہا گیا ہے لیکن یہ چیز اللہ تعالےٰ کے بحیثیت مالک اور خالقِ لاشریک ہونے کے منافی نہیں ہے اور نہ ہی اس حقیقت کے منافی ہے کہ کوئی موجود بھی اللہ کے ساتھی، مددگار حتیٰ کہ آپ کی حیثیت اس کا ولی نہیں۔

ولم یکن لہ شریک فی الملک ولم یکن لہ ولی من الذل وکبرہ تکبیرا۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۱۱۱)

مخلوق کی خالق سے اس کے علاوہ اور کوئی نسبت نہیں کہ وہ خالق کے مقابلے میں مخلوق ہے اور مکمل طور پر اس کا محتاج ہے اور لاشئے ہے۔

قرآن مجید کے مطابق اللہ تعالےٰ مکمّل طور پر غنی اور بے نیاز ہے۔ تاہم جہاں وہ یہ کہتا ہے کہ " اللہ ہی لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں اپنی طرف کھینچ بلاتا ہے"۔ (سورۂ زمر۔ آیت ۴۲) وہاں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ:

"اے رسولؐ! کہہ دیجیے کہ ملک الموت جو تمہارے اوپر تعینات ہے وہی تمہاری روحیں قبض کرے گا۔ پھر تم سب کے سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے"۔ (سورۂ سجدہ۔ آیت ۱۱)

اسی طرح جہاں وہ یہ کہتا ہے کہ:

"بلاشبہ میرا پروردگار ہر چیز کا نگہبان ہے"۔ (سورۂ ہود۔ آیت ۵۷)

وہاں یہ بھی کہتا ہے کہ:

"وہ تم لوگوں پر نگہبان (فرشتے) تعینات کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آئے تو ہمارے فرستادہ (فرشتے) اسے دنیا سے اٹھا لیتے ہیں"۔ (سورۂ انعام۔ آیت ۶۱)

اس آیت میں بھیجے جانے والوں (فرشتوں) کو بطورِ نگہبان اور پھر بطور روحیں قبض کرنے والوں کے متعارف کرایا گیا ہے۔

پس عقیدۂ توحید کے لحاظ سے واسطوں کی موجودگی کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں اور نہ ہی اس چیز میں کوئی حرج ہے کہ کوئی شخص اللہ کی اجازت سے اس کی مرضی کے مطابق کوئی کام سرانجام دے۔ تاہم اسلامی شائستگی کا تقاضا ہے کہ ہم پیدا کرنے، روزی دینے، زندگی بخشنے اور مار دینے جیسے کام اللہ کے علاوہ کسی اور سے منسوب نہ کریں اور اپنی توجہ اس اصلی منبعِ قدرت کی جانب مبذول رکھیں جو کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ واسطے اور فرشتے محض اللہ کی مخلوق اور اس کی عظیم قوت اور حکمت کا مظہر ہیں۔

کائنات کا نظام چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک بہترین طریقہ وضع فرمایا ہے جس میں فرشتوں کو واسطہ قرار دیا گیا ہے۔ ارتقائی منازل طے کر کے انسان فرشتوں سے بھی اونچا رتبہ حاصل کر سکتا ہے لیکن وہ ان کی بجائے بطور واسطہ جگہ نہیں لے سکتا۔ وحی ہمیشہ فرشتے کے ذریعے نازل کی جاتی ہے اور ایک فرشتہ ہی ہے جسے ہر شخص کی روح قبض کرنے پر مامور کیا گیا ہے اور فرشتے ہی انسان کی حفاظت پر مامور ہیں۔

دوسری بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ ہم ایک کامل یا نسبتاً کامل انسان کی ولایتِ تصرّف یا ولایتِ تکوینی کی حدود کا صحیح صحیح تعین نہیں کر سکتے۔ تمام قرآنی اور علمی قرینے جو ہمیں دستیاب ہیں ان سے اجمالاً پتا چلتا ہے کہ انسان ایک ایسے مقام پر پہنچ سکتا ہے جہاں اس کا ارادہ دنیا پر حکومت کرے لیکن اس کے اس تصرف کی کیا حدود ہیں اور آیا کوئی حدود ہیں بھی یا نہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہماری دسترس سے باہر ہے۔

ایک اور نکتہ جس کا بیان ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ولایتِ تصرّف صرف اس شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جو نفسانی خواہشات اور ہوا و ہوس کے تسلّط سے قطعاً آزاد ہو۔ یہ ولایت کسی متکبّر اور خود غرض شخص کو نہیں مل سکتی۔ ایک خود رائے شخص ایسے معجز آسا عہدے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اس ولایت کا حامل ہو وہ اس قدر پاکیزہ اور طاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ارادے کے برعکس اس کا ارادہ اندرونی تحریک اور غیبی اشارے سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ تاہم ہمیں اس بات کا کوئی علم نہیں کہ اس غیبی اشارے کی کیا نوعیت ہے اور وہ شخص اسے کس طرح حاصل کرتا ہے بعض اوقات ایک غیبی روشنی ایسے اشخاص کی رہنمائی کرتی ہے جس کی بنا پر بہت سے راز ان پر منکشف ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انہیں معمولی باتوں تک کا پتا نہیں چلتا۔

جہاں تک آیتِ قرآنی "(اے رسولؐ!) کہہ دیجیے کہ میں خود کو نفع یا نقصان پہنچانے کا اختیار ہی نہیں رکھتا" (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۸۸) کا تعلق ہے صاف ظاہر ہے کہ رسولِ اکرمؐ سے یہ کہنے کو کہا جا رہا ہے کہ تمام نفع و نقصان دراصل اللہ کے اختیار میں ہے ورنہ یہ تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں دوسرے لوگ مخصوص حدود میں اپنے نفع اور نقصان پر اختیار رکھتے ہیں، اللہ کے رسول کو ایسا کوئی اختیار حاصل نہ ہو۔

یہ تین نکات تھے جن کا ذکر کرنا ولایتِ تکوینی کی مفصّل بحث سے پہلے بطور تمہید ضروری تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت کم بحث کی جاتی ہے لیکن چونکہ نوجوانوں نے اس میں دلچسپی ظاہر کی ہے اس لیے ہم اس بارے میں قدرے تفصیل سے بحث کریں گے۔

ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ولایت کا ان معنوں میں تسلیم کرنا قدرے دشوار ہے۔

ہمارا روشن خیال طبقہ ایسے مسائل سے خوش نہیں ہوتا۔ وہ لوگ اکثر اعتراض کرتے ہیں کہ جب مسلمانوں کو کئی ایک اور اہم اور ضروری مسائل درپیش ہیں تو اس مسئلے پر بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ آیا رسولِ اکرمؐ اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام ولایت تکوینی کے حامل تھے یا نہیں۔ ان میں سے بعض اس ولایت کا انکار کرتے ہوئے اسے مذہبی رنگ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس قسم کے تصرف کو تسلیم کرنے کے یہ معنی ہیں کہ انسانوں کو مافوق البشر مان لیا جائے اور انہیں نیم دیوتا کا رتبہ دے دیا جائے۔ خدا کے کام کو غیر خدا کی طرف نسبت دینا شرک ہے اور یہ چیز توحید الٰہی کے منافی ہے جو کہ اسلام کا بنیادی اصول ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں یہ اختیار حاصل نہیں کہ اپنی مرضی سے کسی مطلب کو قبول کر لیں یا رد کر دیں۔ کسی نظریے کے شرک یا توحید پر مبنی ہونے کا انحصار ہمارے ارادے اور خواہش پر نہیں ہے تاکہ ہم جس چیز کو چاہیں شرک قرار دیں اور جسے چاہیں توحید کا نام دے دیں۔ اس کے لیے بڑے دقیق قرآنی اور منطقی معیارات مقرر ہیں۔ شرک اور توحید سے متعلقہ مسائل کے بارے میں اسلامی علوم اتنی بلندی اور عظمت کے حامل ہیں کہ عام افراد اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بعض مسائل کا دوسروں کے مقابلے میں فوری اور ضروری ہونا بھی بنیادی حیثیت رکھتا ہے لیکن کسی مسئلے کے ضروری ہونے کا معیار فقط یہ نہیں ہے کہ ایک زمانے میں اسے زیادہ شدومد سے پیش کیا جائے اور لوگ اس کی ضرورت کا زیادہ احساس کریں۔ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ ضرورتوں کا احساس خود ضرورتوں کے مطابق ہوتا ہے۔

اپنے مسائل اور معارف پیش کرتے وقت قرآن مجید جن مطالب پر زور دیتا ہے وہ بجائے خود ایک معیار ہے جس سے ہر زمانے میں استفادہ کرنا چاہیے۔

ولایت تکوینی کا تعلق انسان اور اس کی صلاحیتوں سے ہے۔ قرآن مجید انسان اور اس کی صلاحیتوں اور اس کی تخلیق کے غیر معمولی پہلو کو بے حد اہمیت دیتا ہے۔ ہم انشاء اللہ اپنی آئندہ تصنیف "قرآن اور انسان" میں اس مسئلے پر مزید روشنی ڈالیں گے۔ فی الحال مختصراً یہ بتانا کافی ہوگا کہ قرآن کا نظریہ ولایت کیا ہے تاکہ بعض لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ایک "قلندری" بات ہے۔

بعض اوقات اس قسم کے مسائل کا ادراک مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن ایسے حالات میں مسئلے کی حقیقت کا انکار کرنے سے بہتر ہے کہ ہم خود اپنا عجز تسلیم کریں۔

بلاشبہ چوتھے معنی میں ولایت کا مسئلہ عرفانی مسائل میں سے ہے لیکن اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ اسے محض اس بنا پر رد کر دیا جائے۔ گو یہ مسئلہ ایک عرفانی مسئلہ ہے لیکن تشیّع کے نقطۂ نگاہ سے یہ ایک اسلامی مسئلہ بھی ہے۔ تشیّع ایک مذہب ہے اور عرفان ایک مسلک ہے۔ یہ مذہب اور وہ مسلک (ان سب خرافات سے قطع نظر جو اس سے وابستہ کر دی گئی ہیں) اس نقطے پر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور اگر یہ باور کرنا ضروری ہو کہ ان دونوں میں سے کسی ایک نے یہ نظریہ دوسرے سے مستعار لیا ہے تو تمام تاریخی شواہد اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ عرفان نے یہ نظریہ تشیّع سے حاصل کیا ہے۔ یہاں ہم مختصراً اس رائے کی بنیاد کا ذکر کریں گے۔

اس سلسلے میں جو سب سے اہم مسئلہ قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کیا چیز ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اسلام اور دوسرے تمام آسمانی مذاہب کے دینی اعمال کا انتہائی مقصد قربِ الٰہی کا حصول ہی ہے۔

قربِ خداوندی سے کیا مراد ہے ؟

بعض اوقات روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہونے والے الفاظ کے عام مفہوم سے واقفیت ہمارے لیے گمراہ کن ثابت ہوتی ہے۔

ہم اکثر قرب، نزدیکی، قریب اور نزدیک کے الفاظ ان کے اصلی معنوں یعنی 'جسمانی نزدیکی' کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں: 'اُس پہاڑی کے نزدیک ایک چشمہ ہے'، یا یہ کہ 'میں اس پہاڑی کے قریب گیا'۔ ایسے جملوں سے ہماری مراد حقیقی نزدیکی اور باہمی فاصلے میں کمی ہوتی ہے لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ: 'فلاں شخص فلاں دوسرے شخص کے دل کے بہت قریب ہے'، تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ مقدم الذکر شخص موخرالذکر کا منظورِ نظر ہے۔ یہاں لفظ 'قریب' مجازی طور پر استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ ظاہر ہے یہاں جسمانی فاصلے کا کوئی سوال نہیں بلکہ پیار اور محبّت کو قرب کا نام دیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے قرب یا نزدیکی کی ماہیت کیا ہے؟ کیا لوگ اللہ کے احکام کی پیروی اور اس کی عبادت کرکے اس کی جانب بڑھتے ہیں اور اس کے قریب ہو جاتے ہیں؟ کیا ان کے اور اللہ کے درمیان فاصلہ بتدریج کم ہو جاتا ہے اور بالآخر ختم ہو جاتا ہے اور قرآن مجید کے الفاظ میں "وہ اپنے پروردگار سے ملتے ہیں؟" اگر یہ الفاظ مجازی ہیں تو اللہ کے قریب ہونے کے کیا معنی ہیں؟ ظاہر ہے کہ اللہ کی نسبت سے فاصلے کے کوئی معنی نہیں۔ وہ نہ قریب ہے نہ دور ہے۔

اللہ کے قریب ہونے کے معنی اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے ہیں۔

یعنی اللہ تعالےٰ بندے سے خوش ہوتا ہے اور اسے اپنی عنایتوں سے نوازتا ہے۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اللہ کی خوشنودی کے کیا معنی ہیں؟ خدائے عزوجل کی بزرگ و برتر ذات چونکہ محل حوادث نہیں لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی شخص سے خفا ہو اور پھر اس سے راضی ہو جائے یا یہ کہ وہ کسی سے راضی ہو اور پھر ناراض ہو جائے۔ چنانچہ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ 'خوشنودی' کا لفظ بھی مجازی ہے۔ 'خوشنودی' سے مراد اللہ کی وہ رحمت اور مہربانی ہے جو ان لوگوں پر نازل کی جاتی ہے جو اس کے احکام مانتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔

پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت اور مہربانی کی نوعیت کیا ہے؟ اس نکتے پر آراء میں اختلاف ہے۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق رحمت میں مادی عنایات مثلاً جنت کے باغات، محلات، حوریں اور معنوی عنایات مثلاً علم اور اس سے حاصل ہونے والی خوشی شامل ہیں۔ بعض دوسرے لوگ معنوی عنایات کے منکر ہیں اور اللہ تعالےٰ کی رحمت کو فقط جنت کے باغوں، محلوں اور حوروں کی بدولت حاصل شدہ جسمانی راحت تک محدود سمجھتے ہیں۔ ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قرب الٰہی کے معنی اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہیں کہ جس شخص پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے اسے جنت میں دوسروں سے زیادہ جسمانی راحت نصیب ہوتی ہے۔

اس کے یہ معنی ہیں کہ جو لوگ قربِ حقیقی کے منکر ہیں ان کے مطابق فرمانبرداری اور عبادت نہ تو اللہ کے بندے کے ساتھ تعلقات میں کوئی تبدیلی لا سکتی ہیں (اس کا اعتراف قربِ حقیقی کے مؤیدین بھی کرتے ہیں) اور نہ ہی بندے

کے اللہ کے ساتھ تعلقات ہیں۔ ان کے مطابق حقیقی نزدیکی اور دوری کے لحاظ سے عالم انسانیت کی بزرگ ترین ہستی یعنی حضرت محمدؐ یا شقی ترین انسان مثلاً فرعون اور ابوجہل ایک ہی سطح پر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ غلط فہمی اللہ تعالےٰ اور انسان اور بالخصوص انسان کے بارے میں ایک مادی طرزِ فکر سے پیدا ہوئی ہے۔ جو شخص انسان اور اس کی روح کو فقط پانی اور مٹی کا ایک تودہ سمجھے اور اس اصول کا فاذا سویتہ و نفخت فیہ من روحی (سورۂ حجر- آیت ۲۹) اعتراف نہ کرے اور اسے بھی مجازی معنی پہنائے تو پھر اس کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ قربِ حقیقی سے انکار کر دے۔

لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہم انسان کو اس قدر حقیر سمجھیں کہ ہر چیز کی تاویل اور توجیہ کرنے پر مجبور ہو جائیں؟ اللہ تعالےٰ کمالِ مطلق اور لامحدود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وجود کی حقیقت بھی کمال ہے۔ ہر قسم کا کمال مثلاً علم، طاقت، زندگی، ارادہ، رحمت بھلائی وغیرہ وجود کی طرف لوٹتا ہے جو اصل حقیقت ہے

اللہ محض وجود اور کمال ہے اور تمام موجودات اپنے وجود اور کمال کی شدت اور قوت کی نسبت سے اس کے قریب ہیں۔ قدرتی طور پر جمادات اور نباتات کے مقابلے میں فرشتے اللہ کے زیادہ قریب ہیں۔ فرشتوں میں بھی کچھ ایسے ہیں جو دوسروں کے مقابلے میں اس کے زیادہ قریب ہیں اور اسی بنا پر وہ ان دوسروں کو حکم دیتے ہیں اور ان پر تسلّط رکھتے ہیں۔ قربِ خداوندی کے معاملے میں ان کے مابین اس فرق کا تعلق ان کی تخلیق میں اختلاف کی بنا پر ہے۔ اصطلاحاً اسے 'قوسِ نزول' کا فرق کہا جا سکتا ہے۔

تمام موجودات اور بالخصوص انسان کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ چونکہ

انسان وجود کی ایک اعلیٰ سطح پر ہے اس لیے اس کی واپسی بھی اس شکل میں ہونی چاہیے کہ وہ اللہ کے احکام برضا و رغبت بجا لائے۔ نیکی اور اللہ کی فرمانبرداری کے راستے پر چلتے ہوئے وہ حیوانی سطح سے بڑھ کر فرشتوں سے بلند تر مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی یہ بلند پروازی اور ترقی نہ تو رسمی اور انتظامی ہے اور نہ ہی اسمبلی کے ایک عام رکن کی بطور وزیر تقرری یا کسی جماعت کے عام رکن کے قائد کے رتبے پر فائز ہونے کی طرح معاہداتی ہے۔ بلکہ یہ وجود کی سیڑھیاں طے کرنا ہے۔ یہ وجود کا شدّت، قوّت اور کمال حاصل کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم، قدرت، زندگی، ارادے اور عزم میں اضافہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نفوذ اور تصرّف کا دائرہ وسیع ہو۔ اللہ کے قرب کے معنی یہ ہیں کہ واقعی وجود کی منزلیں طے کی جائیں اور لامتناہی ہستی کے نزدیک ہوا جائے۔

یہ ناممکن ہے کہ اپنی فرمانبرداری کے نتیجے میں انسان فرشتوں کے مقام تک نہ پہنچے بلکہ وہ اس سے آگے بھی جا سکتا ہے۔ قرآن مجید انسان کے مقام کی توثیق کرتے ہوئے کہتا ہے:

"جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے علاوہ سب کے سب سجدے میں جھک گئے۔"

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۳۴)

پس بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو کوئی انسان کے اس مقام سے انکار کرے وہ ابلیس ہے۔

ظاہری اور معنوی زندگی

اپنی ظاہری حیوانی زندگی کے اندر انسان ایک معنوی زندگی بھی رکھتا ہے۔ معنوی زندگی جس کی استعداد ہر شخص میں پوشیدہ ہے اس کے اعمال اور مقاصد کی پختگی اور کمال سے جنم لیتی ہے۔ انسان کی خوش نصیبی اور بدنصیبی اس کی معنوی زندگی سے تعلق رکھتی ہے جس کا انحصار اس کے اعمال، نیتّوں اور اس کے پیش نظر مقصد پر ہوتا ہے۔

ہم زیادہ تر اسلامی تعلیمات کے ان پہلوؤں سے واقف ہیں جن کا تعلق اس دنیا کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی تعلیمات زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں حکمت اور فلسفے سے مالامال ہیں۔ اسلام زندگی کے مسائل کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق اس دنیا میں زندگی سے جدا معنویت کا کوئی وجود نہیں۔ جس طرح روح کے بدن سے جدا ہو جانے کے بعد اس کا تعلق اس دنیا سے ختم ہو جاتا ہے اسی طرح زندگی کے بغیر معنویت کا اس دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ زندگی کو منہا کرنے کے بعد معنویت کے بارے میں گفتگو کرنا ایک لایعنی بات ہے۔

تاہم جو کچھ اوپر کہا گیا اس سے یہ مطلب اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ اسلامی تعلیمات کا فلسفہ فقط زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے مخصوص ہے۔ اسلام کی تعلیمات اللہ کی فرمانبرداری اور اس کے قرب کے حصول کے راستے پر گامزن ہونے اور یوں وجود کا کمال حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ انسان جسم، مادّے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ماورا ایک باطنی کمال کا سفر کر سکتا ہے۔ اس سفر

کا سرچشمہ کئی ایک معنوی مقامات ہیں۔ انسان اپنی عبودیت اور اخلاص کے ساتھ عملاً ان مقامات کی سیر کرتا ہے جو اکثر اسی دنیا میں، ورنہ دوسری دنیا میں ہوتی ہے جبکہ پردے ہٹ جاتے ہیں اور وہ ان تمام مقامات کا مشاہدہ کرتا ہے جو اس نے طے کیے ہوتے ہیں اور جو قرب کے مقامات اور مراتب اور نتیجتاً ولایت ہیں۔

نبوّت اور ولایت

حضرت استاذنا الاکرم علامہ طبا طبائی نے فرمایا ہے:

"اسلامی تعلیمات کا ایک حصّہ اجتماعی ضوابط پر مشتمل ہے جو بظاہر اجتماعی سوچ بچار کا نتیجہ ہیں۔ دوسری دنیا کی خوش بختی یا بدبختی یا دینی اصطلاح میں جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی سزاؤں سے ان ضوابط کا تعلق چند ایسے مظاہر کی وجہ سے ہے جو انسان کے ان ضوابط پر عمل کرنے یا ان کی خلاف ورزی کرنے کے دوران جنم لیتے ہیں اور غیر محسوس طور پر نشو و نما پاتے ہیں۔ جب انسان دوسری دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے اور غفلت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو یہ تعلق منظرِ عام پر آجاتا ہے اور خود انسان پر واضح ہو جاتا ہے۔ مذہبی تعلیمات کے عین مطابق گزاری گئی اجتماعی زندگی کی تہوں کے نیچے ایک زندہ حقیقت یعنی ایک معنوی زندگی وجود رکھتی ہے جو دوسری دنیا کی ابدی سعادت کا سرچشمہ ہے۔ اس حقیقت کو "ولایت" کا نام دیا گیا ہے۔ نبوّت ایک ایسی حقیقت ہے جو زندگی کے بارے میں اللہ تعالےٰ کے اوامر و نواہی وصول کرتی ہے اور لوگوں تک پہنچاتی ہے۔ ولایت بھی ایک حقیقت

ہے۔ یہ نبوت کی وساطت سے حاصل کیے گئے احکامِ الٰہی پر عمل کرنے کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے۔"

امام بطورِ حاملِ ولایت

علامہ طباطبائی ولایت اور اس کے حامل "امام" کے ثبوت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ دنیا ولایت کے حامل یعنی ایک انسانِ کامل سے کبھی خالی نہیں رہی، فرماتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ ولایت کا ایک ایسا راستہ موجود ہے جس پر گامزن ہونے سے انسان معنوی کمال کے مختلف مراحل طے کرتا ہے اور قربِ الٰہی کے مرحلے پر پہنچ جاتا ہے کیونکہ ایک باطنی حقیقت کے بغیر ظاہری دینی پابندیوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تخلیقی قوّت یا ماٰخذ جس نے انسان کے لیے دینی ظواہر یعنی عملی، اخلاقی اور اجتماعی ضوابط کا اہتمام کیا ہے اور اسے ان کی جانب دعوت دی ہے اس نے لازمی طور سے اس باطنی حقیقت کے لیے بھی اہتمام کیا ہوگا جو دینی ظواہر کے لیے روح کی حیثیت رکھتی ہے۔"

جو دلائل نبوّت کا وجود اور اس کا دوام (یعنی اس کے لائے ہوئے مذہبی احکام کا دوام) ثابت کرتی ہیں وہی امامت کا نظام اور اس کا دوام بھی ثابت کرتی ہیں۔ یہ کیونکر تصور کیا جاسکتا ہے کہ قوانین وضوابط تو واقعی موجود ہوں لیکن باطنی حقیقت کا کوئی وجود نہ ہو یا عالمِ انسانیت کا رابطہ اس سے منقطع ہو جائے؟ جو شخص اہلِ ولایت کا میر کارواں ہو اور انسانیت سے اس حقیقت

کا رابطہ برقرار رکھے اُسے قرآن مجید "امام" کا نام دیتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت سے واضح ہے:

"اور جب ابراہیم کو اس کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ انہوں نے پوری کر دیں تو اس نے فرمایا: میں تمہیں بنی نوع انسان کا امام بنانے والا ہوں۔" (سورۂ بقرہ - آیت ۱۲۴) [۱]

امام وہ شخص ہے جس کا انتخاب اللہ تعالےٰ صراطِ ولایت کے پیشوا کے طور پر کرتا ہے۔ وہ باطنی ولایت کی باگ ڈور سنبھالتا ہے۔ وہ ولایت کی ان شعاعوں کا مرکز ہوتا ہے جو لوگوں کے دلوں کو منور کرتی ہیں۔

اصولِ کافی (باب: ان الائمہ نور اللہ) کے مطابق ابو خالد کابلی نے نقل کیا ہے کہ اس نے امام باقر علیہ السلام سے مندرجہ ذیل آیت قرآنی کے بارے میں سوال کیا:

"پس اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا۔" (سورۂ تغابن - آیت ۸)

امام علیہ السلام نے آیت کے معنوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"خدا کی قسم اے ابو خالد! امام کی روشنی مومنین کے دلوں میں سورج کی روشنی کے مقابلے میں زیادہ آب و تاب سے چمکتی ہے۔"

آپ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ بات غلط ہے کہ دینی تعلیمات کا مقصد دنیاوی زندگی میں اچھے نتائج برآمد کرنے تک محدود سمجھا جائے اور قرب الٰہی (جو اچھے اعمال کا براہِ راست نتیجہ ہے) کی تاویل ان معنوں میں کی جائے کہ

---

[۱] تفصیلات کے لیے علامہ طباطبائیؒ کی تفسیر المیزان ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ کی خوشنودی ایک ایسی چیز ہے جیسی خوشنودی دنیا میں بر سرِ اقتدار لوگوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اس قسم کی تاویل اس موثر کردار کو نظر انداز کر دیتی ہے جو قربِ الٰہی انسان کی زندگی میں ادا کرتا ہے۔ قربِ الٰہی انسان کو وجود کے زینے سے بلند مقام پر لے جاتا ہے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ جو لوگ قربِ الٰہی کے بلند ترین مراحل طے کرتے ہیں اور مرکزِ وجود کے قریب تر ہو جاتے ہیں وہ دنیا پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی ارواح اور ضمائر پر قابو پاتے ہیں اور ان کے اعمال کے شاہد ہوتے ہیں۔

بنیادی طور پر ہر وہ موجود جو کمال کے راستے پر گامزن ہوتا ہے قربِ الٰہی کے کچھ مراحل طے کرتا ہے۔ انسان بھی موجودات میں سے ہے۔ اس کا کمال محض اس چیز تک محدود نہیں جسے آجکل تمدن یعنی سائنس اور فن کی مختلف شاخوں اور انفرادی اور اجتماعی طرزِ سلوک کے ان قواعد کی ترقی کہا جاتا ہے جو موجودہ دور میں مفید ہیں بلکہ انسان کے لیے ایک اور راستہ بھی ہے جو تہذیبِ نفس اور اللہ سے رابطہ قائم کر کے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

بندگی سے ربوبیت تک

"بندگی سے آقائی تک" کا تصور بڑا تکلیف دہ ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بندہ بندگی کی حدود سے نکل کر خدائی کی حدود میں قدم رکھے؟ "این التراب ورب الارباب؟"

بقول محمود شبستری:

"دونوں جہاں میں روسیاہی ممکن سے ہرگز جدا نہیں ہو سکتی اور اللہ بہتر جاننے والا ہے۔"

یہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن "ربوبیت" سے مراد خدائی نہیں بلکہ آقائی ہے۔ ہر وہ شخص جو قدرت رکھتا ہے اس چیز کا آقا ہے جس پر اسے اختیار اور تصرف حاصل ہو۔ جناب عبدالمطلبؑ نے ابرہہ سے جو خانہ کعبہ گرانے آیا تھا فرمایا تھا:

انی رب الابل و ان للبیت رب

یعنی میں اونٹوں کا مالک ہوں اور ان کا مطالبہ کرنے آیا ہوں۔
جہاں تک اس گھر کا تعلق ہے اس کا خود ایک مالک ہے۔

ہم نے یہ معنی ایک مشہور حدیث کی پیروی کرتے ہوئے اخذ کیے ہیں جو مصباح الشریعۃ میں نقل کی گئی ہے۔ اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ:

العبودیۃ جوھرۃ کنھھا الربوبیۃ

"اللہ کی بندگی ایک گوہر ہے جس کی انتہا آقائی یعنی قدرت اور توانائی ہے۔"

انسان ہمیشہ اس کوشش میں رہا ہے کہ کوئی ایسا طریقہ دریافت کرے جس کی بدولت اپنے آپ پر اور دنیا پر غلبہ حاصل کر سکے۔

بالفعل ہمیں اس بات سے غرض نہیں کہ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے کونسے طریقے اختیار کیے اور آیا اسے اس میں کامیابی ہوئی یا نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس مقصد کو حاصل کرنیکا ایک اور نادر طریقہ بھی ہے۔ جب انسان وہ طریقہ اپناتا ہے تو اس کا مقصد طاقت حاصل کرنا اور دنیا پر غلبہ پانا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس انکسار اور اپنے آپ کو فنا کر دینا ہوتا ہے۔ یہ نادر طریقہ بندگی کا ہے۔ جو شخص اللہ تعالٰی کی متابعت اختیار کرتا ہے وہ ہر چیز پا لیتا ہے گو وہ کسی بھی چیز کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

مراحل و منازل

انسان کی بندگی، اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی حقیقی فرمانبرداری سے جو کمال اور قدرت حاصل ہوتی ہے اس کے کئی مراحل ہیں۔

پہلا مرحلہ بے حد روحانی تاثیر کا حامل ہے۔ اس مرحلے پر انسان اپنے نفس پر قابو پا لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جب اللہ تعالیٰ انسان کے نیک اعمال قبول فرماتا ہے تو اس کا کم سے کم اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو واضح طور پر دیکھنے لگتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

"اگر تم تقوائے الٰہی اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے لیے ایک مایۂ تمیز پیدا کر دے گا۔" (سورۂ انفال۔ آیت ۲۹)

پھر فرماتا ہے:

"جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستے دکھا دیتے ہیں۔" (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۶۹)

یوں انسان اپنے نفس اور حیوانی خواہشات پر قابو پا لیتا ہے اور خود اپنا آقا بن جاتا ہے۔ قرآن مجید نماز کے بارے میں فرماتا ہے:

"بلاشبہ نماز انسان کو ناپسندیدہ اور برے کاموں سے روکتی ہے۔" (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۴۵)

روزے کے بارے میں فرماتا ہے:

"تم پر روزے اسی طرح فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے پہلی امتوں پر فرض تھے تاکہ تم ان کے ذریعے تقویٰ اختیار کرو اور

اپنے اندر گناہوں سے بچنے کی قوت پیدا کرو۔"

(سورۂ بقرہ - آیت ۱۸۳)

پھر ان دونوں عبادات کے متعلق فرماتا ہے:

"اے ایمان والو! نماز اور صبر (روزے) سے مدد حاصل کرو اور ان دو منابع سے قوت حاصل کرو۔" (سورۂ بقرہ - آیت ۱۵۳)

اللہ کی بندگی کے اس مرحلے پر جو چیز انسان کو حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک خاص بصیرت کی بدولت وہ اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پا لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں بندگی کا پہلا نتیجہ نفسِ امارہ پر ربوبیت اور ولایت حاصل کرنا ہے۔[1]

دوسرا مرحلہ قوتِ متخیلہ یعنی پراگندہ خیالات پر قابو پانا ہے۔ ہماری قوتوں میں سے قوتِ متخیلہ سب سے زیادہ عجیب ہے۔ اس قوت کی وجہ سے ہمارا دماغ ہر لحظہ ہماری توجہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی جانب منتقل کرتا رہتا ہے۔ یہ قوت ہمارے اختیار میں نہیں بلکہ ہم اس کے اختیار میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم خواہ کتنا بھی چاہیں اپنی توجہ ایک مخصوص چیز پر مرکوز نہیں رکھ سکتے۔ مثلاً اپنی تمام کوششوں کے باوجود ہم نماز کے دوران اپنے خیالات مجتمع نہیں رکھ سکتے۔

رسول اکرمؐ نے اس حقیقت کے بارے میں بڑی دلآویز مثال دی ہے۔ آپ نے ایک ایسے دل کو جو قوتِ متخیلہ کے زیرِ اثر ہو ایک ایسے پر سے تشبیہ دی ہے جو ایک جنگل میں ایک ایسے درخت پر لٹکا ہوا ہو اور جسے ہوا ہر لحظہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر حرکت دے رہی ہو۔

آپ فرماتے ہیں:

---

[1] "تقویٰ" کی تشریح کے لیے آیت اللہ مطہری کی کتاب 'سخن' مطبوعہ جامعۂ تعلیمات اسلامی ملاحظہ ہو۔

مثل القلب مثل ریشۃ فی الفلاۃ ، تعلقت فی اصل شجرۃ
یقلبھا الریح ظھرًا البطن [1]

گفت پیغمبر کہ دل ہمچون پری است
در بیابانی اسیر صرصری است
باد پر را ہر طرف راند گزاف
گہ چپ و گہ راست با صد اختلاف

ایک اور حدیث میں آنحضرت ؐ نے فرمایا ہے :

لقلب ابن آدم اشد انقلابا من القدر اذا اجتمعت غلیا

"انسان کے دل میں ایک ابلتی ہوئی دیگ سے بھی زیادہ ہیجان ہوتا ہے۔" [2]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ اپنے خیالات کا محکوم رہے اور یہ پراسرار قوت جو ایک پرندے کی طرح ایک شاخ سے دوسری شاخ کی جانب اڑتی پھرتی ہے اس کے وجود پر مکمل طور پر مسلط ہو یا یہ کہ قوتِ متخیلہ کا محکوم ہونا انسان کے خام اور ادھورا ہونے کی بنا پر ہے اور جن لوگوں کی روحانیت مکمل طور پر نشوونما پا چکی ہو وہ اس بات پر قادر ہوتے ہیں کہ اس خودسر قوت (یعنی قوت متخیلہ) کو اپنے قابو میں لے آئیں۔

دوسری شق درست ہے۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ اپنے خیالات کی پرواز کو قابو میں لے آئے ورنہ یہ شیطانی قوت اس کی ہر استعداد کو تباہ و برباد کر دے گی اور

---

[1] نہج الفصاحت و جامع صغیر (جلد ۱۔ صفحہ ۱۰۲)

[2] مسند احمد حنبل (جلد ۶۔ صفحہ ۴)

اسے قربِ الٰہی کے راستے پر گامزن نہیں ہونے دیگی اور انسان میں موجود تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو ضائع کر دے گی۔

جیسا کہ معروف صوفی شاعر مولوی (جلال الدین رومی) نے کیا خوب کہا ہے:

"اگر انسان ہر وقت اپنے آرام اور تکلیف اور نفع اور نقصان کے خیالات میں غرق رہے تو وہ سکونِ قلب کھو دیتا ہے اور عالمِ بالا میں پرواز کے قابل نہیں رہتا۔"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

تنام عیناى ولا ینام قلبى

"ہماری آنکھیں سوتی رہتی ہیں لیکن ہمارا دل جاگتا رہتا ہے۔"

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے مولوی نے کہا ہے کہ آنحضرت کا دل ہر وقت جاگتا رہتا تھا کیونکہ انہیں اپنے خیالات پر قابو حاصل تھا۔ وہ اپنے خیالات کو ہمیشہ زیرِ تسلط رکھتے تھے اور کبھی ان سے مغلوب نہیں ہوتے تھے۔

اس دوسرے مرحلے پر جو لوگ اللہ کی بندگی کا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ قوّتِ متخیّلہ کو قابو میں لا کر وہ کسی مزاحمت اور رکاوٹ کے بغیر آزادی سے بلندیوں کی جانب پرواز کر سکتے ہیں۔

امام علی ابن ابیطالب اور امام علی ابن حسین علیہم السلام نماز میں اس قدر محو ہو جاتے تھے کہ ایک دفعہ ایک تیر جو امام علی ابن ابیطالب کے پاؤں میں پیوست ہو گیا تھا اس وقت کھینچ کر نکال لیا گیا جب وہ نماز ادا کر رہے تھے لیکن انہیں اس چیز کا مطلقاً احساس نہیں ہوا۔ اسی طرح کی صورت اس وقت پیدا ہوئی جب امام علی زین العابدین علیہ السلام کا ایک کمسن بچہ ایک بلند جگہ سے نیچے گر پڑا اور اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ گھر میں کافی چیخ پکار مچی لیکن امام علیہ السلام کو جو اس وقت نماز ادا کر رہے تھے خبر تک نہ ہوئی۔ ایک ہڈی جوڑنے والے کو بلایا گیا

جس نے بچے کی ہڈی درست کر کے پٹی باندھ دی۔ جب نماز سے فارغ ہونے کے بعد امام زین العابدینؑ کی نگاہ بچے کے ہاتھ کی پٹی پر پڑی تو انہیں بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے اس کے بارے میں استفسار کیا۔ آپ نماز میں اسقدر محو تھے کہ گھر میں جو چیخ پکار مچی اور بھاگ دوڑ ہوئی اس کا آپ کو علم نہ ہوا۔

ان بزرگوار ہستیوں کی تو خیر بات ہی الگ ہے۔ ہم نے ان کے پیرووں میں بھی ایسے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں جو نماز پڑھتے ہوئے اس قدر مستغرق ہو جاتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ انہیں کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ ہمارے استاد بزرگوار حاج میرزا علی آقا شیرازی اصفہانی اعلی اللہ مقامہ، ایسے ہی اشخاص میں سے تھے۔

یہ کامیابی حاصل کرنے کیلئے کوئی چیز اتنی مؤثر نہیں جتنی وہ عبادت ہے جس کی بنیاد اللہ کی جانب توجہ پر ہو ریاضت کش لوگ دوسرے طریقے اختیار کرتے ہیں اور عموماً ترکِ دنیا کر کے اور بدن کو اذیت دے کر بہت معمولی حد تک یہ مقصد حاصل کرتے ہیں۔ تاہم اسلام ایسے ناپسندیدہ مشاغل کی ضرورت محسوس کیے بغیر عبادت کے ذریعے مطلوبہ مقصد حاصل کرتا ہے۔ جب اللہ کی جانب کامل توجہ دی جائے اور یہ یاد رکھا جائے کہ انسان آقاؤں کے آقا اور خالق و مالک کے سامنے کھڑا ہے تو جمعیتِ خاطر کی راہ ہموار ہو جاتی ہے اور ذہن میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے۔

زلف آشفتۂ او باعث جمعیت ما است

چوں چنیں است پس آشفتہ ترش باید کرد

یہاں شیخ فلاسفہ اسلام بوعلی سینا کا قول نقل کرنا تائید سے خالی نہ ہوگا۔ یہ نابغۂ دہر اس عام عبادت کا ذکر کرنے کے بعد جو فقط اجر کی خاطر کی جاتی ہے اور جس کی کوئی خاص قدر و قیمت نہیں اپنی کتاب 'اشارات' کے نویں باب میں معرفت سے وابستہ عبادت کے متعلق کہتا ہے:

"اہلِ معرفت کے نزدیک عبادت تخیّلی اور تصوّراتی قوتوں کی ایک ورزش ہے جس کا مقصد ان کی توجہ مادی چیزوں سے ہٹا کر ملکوتی تصوّرات کی طرف مبذول کرنا ہے مسلسل مشق کے بعد یہ قوتیں انسان کی حق پرستی کی فطرت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور جب انسان کی باطنی روح روشنی حاصل کرنا چاہے تو سدِّ راہ نہیں ہوتیں۔"

تیسرے مرحلے پر روح اس قدر قوی ہو جاتی ہے کہ اکثر معاملات میں اسے بدن کی ضرورت نہیں رہتی حالانکہ بدن کو ہر حالت میں روح کی ضرورت ہوتی ہے۔

عام حالات میں روح اور بدن ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ بدن کو اپنی زندگی اور وجود کے لیے روح کی ضرورت ہے اور روح کے بغیر بدن جلد ہی ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح روح کو اپنے افعال کے لیے بدن کا سہارا لینا پڑتا ہے اور بدن کے بغیر وہ کوئی کام انجام نہیں دے سکتی۔ محض چند استثنائی حالات میں روح بدن سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ بے نیازی چند لمحوں کے لیے ہوتی ہے اور بعض اوقات دائمی ہوتی ہے اس صورتِ حال کو "خلع بدن" کہا جاتا ہے۔

معروف اشراقی حکیم سہروردی نے کہا ہے:

"ہم کسی شخص کو اس وقت تک حکیم نہیں سمجھتے جب تک وہ شخص 'خلع بدن' نہ کر سکتا ہو۔"

میر داماد نے کہا ہے:

"ہم کسی شخص کو اس وقت تک حکیم نہیں سمجھتے جب تک 'خلع بدن' اس کی فطرتِ ثانیہ نہ بن گئی ہو اور وہ جب چاہے یہ فعل انجام دے سکتا ہو۔"

تاہم محققین کا کہنا ہے کہ خلع بدن۔ کمال کے کسی اونچے درجے کے حصول کا ثبوت نہیں ہے یعنی عالمِ مثال سے گزرنے اور غیبِ معقول میں قدم رکھنے سے قبل ہی ایک آدمی اس مرحلے تک پہنچ سکتا ہے۔

چوتھا مرحلہ یہ ہے کہ انسان کا بدن ہر لحاظ سے خود اس کے فرمان اور ارادے کے تابع ہو جائے اور جب بھی وہ چاہے خارق العادت کام انجام دے۔ بہرحال اس نکتے پر طویل بحث کی ضرورت ہے۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

ما ضعف بدن عما قویت علیہ النیۃ

"جو کچھ ارادہ چاہے بدن اسے انجام دینے کے قابل نہ ہونے کا اظہار نہیں کرتا"

پانچواں مرحلہ بلندترین مرحلہ ہے۔ اس مرحلے پر بیرونی فطرت تک انسان کے ارادے کے تابع ہو جاتی ہے اور اس کے احکام مانتی ہے۔ انبیائے کرامؑ اور اولیائے حق نے جو معجزے اور کرامات دکھائی ہیں وہ اسی زمرے میں آتی ہیں۔

گو معجزات کا مسئلہ مفصل بحث کا متقاضی ہے لیکن مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ کوئی شخص جو آسمانی مذاہب پر ایمان رکھتا ہو ان سے انکار نہیں کرسکتا۔ مثلاً یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص مسلمان ہو اور قرآن پر ایمان اور اعتقاد رکھتا ہو لیکن معجزات کا منکر ہو۔ اسلامی زاویۂ نگاہ سے معجزات کا مسئلہ ایک حل شدہ مسئلہ ہے۔[1] ہم یہاں اس مسئلے کے بارے میں "ولایتِ تصرف" کے نقطۂ نظر سے بحث کریں گے اور قدرتی طور پر ہمارا روئے سخن ان لوگوں کی جانب ہے جو

---

[1] اس موضوع پر آیت اللہ العظمیٰ آقائے خوئی کی کتاب 'فلسفہ معجزہ'، مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی ملاحظہ فرمائیں۔

قرآن مجید پر ایمان اور اعتقاد رکھتے ہیں اور معجزات کے وقوع پذیر ہونے کے قائل ہیں۔ ہم یہاں جس نکتے پر زور دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ معجزہ فقط ولایتِ تصرف اور ولایتِ تکوینی کا مظہر ہے۔ قرآنِ مجید سے قطع نظر جو کہ معجزہ ہونے کے ساتھ ساتھ رسولؐ کا نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے اور اس لیے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک نبی یا ولی معجزہ دکھاتا ہے کیونکہ اسے اللہ کی جانب سے ایک خاص قوّت عطا کی جاتی ہے۔ وہ کائنات کے ساتھ جو جی چاہے کرتا ہے لیکن یہ سب کچھ اللہ کے اذن سے ہوتا ہے۔ وہ ایک عصا کو اژدہا میں تبدیل کر سکتا ہے۔ مادر زاد نابیناؤں کی آنکھوں کو روشنی دے سکتا ہے حتیٰ کہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ اسے یہ غیر معمولی قوت قربِ الٰہی کی راہ پر چلنے اور مرکزِ ہستی کے قریب تر ہونے کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ معجزہ براہِ راست اللہ تعالےٰ کی جانب سے وقوع پذیر ہوتا ہے اور انبیاء اور اولیاء کا اس میں کوئی دخل نہیں کیونکہ قوانینِ فطرت میں کوئی تبدیلی لانا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ ان لوگوں کے کہنے کے مطابق معجزے میں انبیاء اور اولیاء کا کردار محض نمائشی ہے۔

تاہم یہ خیال درست نہیں۔ نہ صرف یہ کہ اللہ تعالےٰ کی ذاتِ اقدس کی بلندی اس امر کی اجازت نہیں دے سکتی کہ ایک طبیعی فعل بلاواسطہ اور اس کے قائم کردہ نظام سے باہر وقوع پذیر ہو بلکہ یہ تصوّر قرآن مجید کے مندرجات کے بھی خلاف ہے۔ قرآن مجید نے واضح الفاظ میں معجزہ دکھانے کا کام انبیائے کرام سے منسوب کیا ہے لیکن بلاشبہ وہ یہ معجزے اللہ کے اذن اور اجازت سے دکھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ کے اذن کی نوعیت برائے نام اور انسانی نہیں ہے کہ الفاظ یا اشاروں کے ذریعے کوئی اخلاقی یا سماجی پابندی ختم کر دی جائے۔

اللہ کے اذن سے مراد اس کمال کا عطا کیا جانا ہے جو ایک مافوق الفطرت قوت پیدا کرتا ہے اور اگر اللہ تعالےٰ یہ نہ چاہے کہ معجزہ وقوع پذیر ہو تو وہ اس قوت کو زائل کر سکتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے :

"کسی پیغمبر کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی آیت (معجزہ) دکھائے۔" (سورۂ مومن - آیت ۷۸)

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ معجزات انبیائے کرام ہی دکھاتے ہیں۔ 'اللہ کے اذن کے ساتھ' کا اضافہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ یہ مغالطہ پیدا نہ ہو کہ یہ مافوق الفطرت کام انجام دینے میں انبیائے کرام اللہ تعالےٰ کے مقابلے میں آزاد ہیں۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں اللہ کے سوا کسی کو کوئی طاقت یا قدرت حاصل نہیں۔ ہر طاقت اور قوت خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، چھوٹی ہو یا بڑی، ذاتِ خداوندی کا سہارا لیتی ہے۔ ہر موجود خواہ وہ کسی مرتبے پر ہو اللہ تعالےٰ کے ارادے اور مشیت کی گزرگاہ اور اس کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ پیغمبر معجزوں سمیت اپنے ہر کام میں اللہ تعالےٰ کے محتاج ہیں اور ہمیشہ اسی سے مدد طلب کرتے ہیں۔

سورۂ نمل میں قرآن مجید نے حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کا قصہ بیان فرمایا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی دعوت پر ملکۂ سبا ان سے ملنے کے لیے روانہ ہوئی۔ حضرت سلیمانؑ یہ چاہتے تھے کہ ملکہ کا تخت اس کی آمد سے پہلے آپ کے پاس لایا جائے۔ کچھ درباریوں نے اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کیں جنہیں حضرت سلیمانؑ نے رد کر دیا۔ بالآخر "ایک شخص جس کے پاس لوح محفوظ کا کچھ علم تھا کہنے لگا: میں آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے تخت آپ کے پاس حاضر کیے دیتا ہوں۔ اور اس نے تخت لا کر پیش کر دیا۔" (سورۂ نمل - آیت ۴۰)

ارشادِ قرآنی کے مطابق جس شخص کے پاس لوحِ محفوظ کا قدرے علم تھا اس

نے کہا کہ میں اتنی قلیل مدت میں تخت لے آؤں گا۔ پس اس نے قدرت اور قابلیت کو خود اپنے آپ سے منسوب کیا۔ ساتھ ہی ساتھ قرآن مجید یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ شخص لوح محفوظ کا کچھ علم رکھتا تھا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے وہ مافوق الفطرت کام ایک خاص علم کی بدولت انجام دیا۔ یہ وہ علم ہے جس سے بنی نوع انسان ابھی تک ناواقف ہیں جسے لوح محفوظ سے ارتباط یعنی قرب الٰہی کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پھر قرآن مجید حضرت سلیمانؑ کے بارے میں ہی فرماتا ہے:

"ہم نے ہوا کو ان کے تابع کر دیا کہ وہ جہاں پہنچنا چاہتے ان کے حکم کے مطابق دھیمے دھیمے چلتی تھی اور اس کے علاوہ جتنے شیطان عمارت بنانے والے اور غوطہ لگانے والے تھے سب کو ان کے تابع کر دیا اور ان کے علاوہ دوسرے دیوؤں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اے سلیمانؑ! یہ ہماری بے حساب عطا ہے۔ پس یہ تم پر ہے کہ اسے لوگوں کو دو یا اپنے پاس رکھو۔"

(سورۂ ص۔ آیات ۳۶ - ۳۹)

جو آیات حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں وہ بھی اس نقطۂ نظر کی تائید کرتی ہیں لیکن ہم طوالت سے بچنے کی خاطر انہیں نقل کرنے سے اجتناب برتتے ہیں۔

جو چیز ہم بالتاکید کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کوئی شخص جو قرآن مجید پر ایمان رکھتا ہو ولایت تصرف سے انکار نہیں کر سکتا لیکن اگر کوئی شخص اس حقیقت کو سائنسی اور فلسفیانہ معیارات پر پرکھنا چاہے تو یہ ایک قطعاً الگ چیز ہے جو ہمارے موجودہ موضوع سے خارج ہے۔ فی الحال ہم اس مسئلے پر

قرآنی نقطۂ نگاہ سے ہی غور کرنا چاہتے ہیں۔

آخر میں ہم ایک اور نکتے پر زور دینا چاہتے ہیں جس کا ذکر ابتدا میں کیا گیا تھا۔ ولایت کے وہ تمام مراحل جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے "قربِ الٰہی" کا نتیجہ ہیں جو ایک تمثیلی اور مجازی اسلوبِ بیان نہیں بلکہ ایک واقعی حقیقت ہے۔ مشہور و معروف "حدیثِ قدسی میں" جسے سنی اور شیعہ دونوں نے روایت کیا ہے یہ حقیقت بڑے دلآویز طریقے سے بیان کی گئی ہے۔ امام جعفر صادقؑ رسولِ اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"مجھ سے قرب حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ان فرائض کا بجالانا ہے جن کا میں نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے۔ اگر میرا کوئی بندہ نوافل اور مستحبات بھی بجالاتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں اور جب کوئی میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بات کرتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ اگر وہ مجھے پکارتا ہے تو میں اسے جواب دیتا ہوں اور اگر مجھ سے کوئی چیز طلب کرتا ہے تو اسے دے دیتا ہوں۔" [1]

اس حدیث سے صاف پتا چلتا ہے کہ عبادت انسان کو اللہ کے قریب لے آتی ہے اور جب وہ اس کے قریب ہو جاتا ہے تو وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اسے اپنی عنایات سے نوازتا ہے۔ پھر وہ الٰہی قوت سے دیکھنے، سننے اور

---

[1] کافی جلد ۱ صفحہ ۳۵۲

بولنے لگتا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں اور اس کی خواہشیں پوری کی جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب تشیّع کی وہ خصوصیّت جو اسے دوسرے اسلامی مذاہب سے ممیّز کرتی ہے انسان کے بارے میں اس کا مخصوص نظریہ ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا اس مذہب کا عقیدہ ہے کہ انسان بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے اور دنیا کبھی ایک کامل انسان یعنی ایسے انسان سے خالی نہیں رہی جس کی تمام صلاحیتیں بروئے کار آچکی ہوں۔ اس کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ انسان اپنا جائز مقام ایک کامل انسان (یعنی ولی اور پیشوا جسے اللہ نے مقرر کیا ہو) کے زیر ہدایت اللہ کی اطاعت کے راستے پر چل کر ہی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی بنا پر مذہب تشیّع کے اولیاء کہتے ہیں کہ:

بنی الاسلام علیٰ خمس : علی الصلوٰۃ والزکوٰۃ والصوم

والحج والولایۃ ولم ینادبشئ کما نودی بالولایۃ[1]

وہ اساسی عقائد جو اسلام کی بنیاد قرار پاتے ہیں پانچ ہیں یعنی نماز، زکات، روزہ، حج اور ولایت ـــــ اور اسلام نے کسی چیز پر اتنا زور نہیں دیا ہے جتنا ولایت پر دیا ہے۔

اب یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مذہب تشیّع نے دوسرے عقائد کے مقابلے میں ولایت پر کیوں زیادہ زور دیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ہر اسلامی عقیدے کے پیچھے کوئی ظاہری یا باطنی فلسفہ کارفرما ہوتا ہے اسی طرح ولایت کا بھی ایک فلسفہ ہے جس کا لب لباب ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ا صفحہ ۴

۱۔ ایک ولی عالمِ انسانیت کو اس کے ممکنہ دشمنوں کے بارے میں خبردار کرتا ہے اور انسان میں ظلم کا مقابلہ کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

۲۔ ایک ولی انسان کے دل میں جمالِ خداوندی کے لیے محبت پیدا کرتا ہے۔

۳۔ ایک ولی انسان کے دل میں برائی اور گناہ کے لیے نفرت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

۴۔ ایک ولی واجب العمل احکام، ہدایات اور قوانین کے اصلی ماخذ کی نشاندہی کرتا ہے۔

۵۔ ایک ولی مذکورہ بالا نظریاتی قلعے کی ہر قیمت پر حفاظت کرنے کیلئے انسان کو تیار کرتا ہے۔

۶۔ ایک ولی انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ اپنی نفسانی خواہشات کے خلاف جہادِ اکبر کر کے انہیں زیر کرے اور احکامِ شریعت کا پرچم بلند رکھے اور ان کی حفاظت کرے۔

۷۔ ایک ولی انسان کے دل میں قربِ الٰہی حاصل کرنے اور اللہ کی مخلوق سے محبت اور مہربانی کا برتاؤ کرنے کا حقیقی جذبہ پیدا کرتا ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس سے واضح طور پر پتا چل جاتا ہے کہ اسلام بالخصوص ولایت پر کیوں زور دیتا ہے اور اس اسلامی عقیدے سے مکمل وابستگی ہمارے لیے کیوں ضروری قرار دی گئی ہے۔

□□□□□□□□□□□□□

ولائے تصرف کی مزید وضاحت

اس گفتگو میں زیرِ بحث موضوع ولایت کے چوتھے معنی ہیں یعنی وہ ولایت جو عرفان اور فلسفے کی زبان میں ولایت تکوینی کے نام سے مشہور ہے اور جس کی بنیاد علم اور عرفان پر ہے۔

ولایت تکوینی انسان کے کمال کی جانب سفر کا نتیجہ ہے جس کا سرچشمہ روحانی اور معنوی مقامات کا ایک سلسلہ ہے۔ انسان اپنے اندر ہی اندر ان مقامات کی سیر کرتا ہے اور پردے اٹھ جانے کے بعد اسی دنیا میں یا موت کے بعد ان کا مشاہدہ کرتا ہے۔

یہ قرب کے وہ درجے اور ولایت کے وہ مقامات ہیں جن کی حقیقت، کمال کے وصف اور خوبصورتی کو سمجھنا عام عقل کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہ راستہ ہے جو ایمان کی پہلی منزل سے شروع ہوتا ہے اور حق تعالےٰ کے قرب کے مقام تک چلا جاتا ہے۔

یہ راستہ کوئی تصوری اور خیالی راستہ نہیں جسے رسمی طور پر راستے کا نام دے دیا گیا ہو بلکہ یہ ایک زندہ حقیقت ہے جو انسان کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور صحیح اعتقاد اور نیک اعمال کے وسیلے سے ــــ مرتبوں میں فرق کیساتھ ــــ اس کی رہنمائی اپنی جانب کرتا ہے اور وہی خدا اور مخلوق کے درمیان واسطہ ہے جو انسان کی رہنمائی کر کے اسے خدا کے نزدیک کرتا ہے۔

یہ حقیقت زوال پذیر نہیں ہوتی اور ہمیشہ کیلئے بنی نوع انسان کے درمیان زندہ و پائیدار اور انکی رہنمائی کیلئے استوار ہے اور ہر زمانے میں ولایت کی حقیقت کی حامل رہی ہے اور رہے گی۔ جس طرح جہانِ ہستی مادی دنیا کی چاردیواری تک محدود نہیں ہے اور مادی دنیا کو خود ایک اور دنیا نے جنم دیا ہے جو اس دنیا کا باطن اور درحقیقت جہانِ ہستی کی بادشاہت ہے۔ اسی طرح انسان کی انسانیت بھی جسم پر منحصر نہیں بلکہ اس کا ایک باطن اور ایک روح ہے جس نے انسانیت کی حقیقت کو شکل وصورت بخشی ہے اور جسم کی حیثیت محض اس کی سواری کی ہے۔

جسم اور روح کی باہمی تاثیر

اب ہمارا موضوعِ بحث روح کا ثابت کرنا نہیں بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں۔ جس طرح روح جسم پر اثر انداز ہوتی ہے اور خوف کے موقع پر چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے اور شرمندگی کے وقت سرخ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جسم بھی روح پر اثر ڈالتا ہے۔ کسی کام کے مسلسل کرتے رہنے سے روح میں فطرتِ ثانیہ یعنی مستقل اور ناقابلِ تسخیر صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ سادہ لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہر اچھا یا برا عمل انسان کے اندر ایک حقیقت وجود میں لاتا ہے جو انسان کی آئندہ زندگی کی تشکیل کرتی ہے۔

جن شرعی احکام پر انسان کو عمل کرنا چاہیے اور ان پر عمل پیرا ہونے پر جو اثر اس کے قرب اور ولایت کا راستہ طے کرنے پر پڑتا ہے ان کے لحاظ سے انسان بعینہ ایک زیرِ تربیت بچے کی مانند ہے۔ وہ سوائے ان احکام کے جو وہ استاد سے "کرو اور نہ کرو" کے الفاظ کی شکل میں سنتا ہے اور اس کے نتیجے میں جو کام انجام دیتا ہے ان کے سوا کچھ نہیں جانتا لیکن جب وہ بڑا ہو جاتا ہے اور اپنی تربیت کا دور مکمل کر لیتا ہے تو ان گرانبہا روحانی خصوصیتوں کی بدولت جو وہ اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے معاشرے میں خوش بختانہ زندگی گزارتا ہے اور اگر اپنے شفیق استاد کے احکام پر عمل کرنے سے سرتابی کرتا ہے تو بجز بدبختی کے اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا یا اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص طبیب کی ہدایات کے مطابق دوائی اور پرہیزی غذا کھاتا ہے اور مخصوص ورزش کرتا ہے۔ وہ بجز ہدایات حاصل کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے کسی چیز سے سروکار نہیں رکھتا لیکن طبیب کی ہدایات پر عمل کرنے سے اس کے بدن میں ایسا اعتدال پیدا ہو جاتا ہے جس کی بدولت اسے تندرستی اور ہر قسم کی خوشی اور کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

انسان اس ظاہری زندگی کے اندر ایک باطنی زندگی بھی رکھتا ہے جو اسکے اعمال سے جنم لیتی ہے اور نشو و نما پاتی ہے۔ اس کا کمال اور خوش بختی اور گراوٹ اور بدبختی مکمل طور پر ان اعمال سے وابستہ ہوتی ہیں[1]

تمام شریعتوں اور انسانی مذاہب میں "عبادت" کے نام سے کچھ اعمال بجالانے کا حکم دیا گیا ہے اور انہیں واجب قرار دیا گیا ہے۔ ان عبادات کا

---

[1] دیکھیے کتاب "پاسداران اسلام" صفحہ ۲۲۴-۲۲۵ مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان۔

بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ انہیں بجالانے سے انسان خود بخود قانون گزار کی عنایت اور توجہ کا مورد بن جائے بلکہ یہ سب انسان کی پیشرفت اور ارتقا کا وسیلہ ہیں ـــــ وہ ارتقا جو اللہ تعالےٰ کو یاد کرنے اور اس کی جانب متوجہ ہونے کے علاوہ کچھ نہیں یعنی یہ عبادات انسان کو معنی اور حقیقت کی دنیا کی طرف متوجہ کرتی ہیں اور مادے اور مادیات کی طرف سے اس کی توجہ ہٹاتی ہیں اور مشقوں کی بدولت اس کا وجود کامل ہوتا ہے اور اس کی ہستی کا دائرہ پھیلتا ہے۔

قربِ الٰہی ہر موجود کی ترقی کا راستہ ہے

بنیادی طور پر ہر موجود جو کمال کے راستے میں قدم بڑھاتا ہے اور کمال کے مرحلے پر پہنچتا ہے وہ خدا کے قرب کا راستہ طے کرتا ہے۔ حق تعالےٰ کا وجود ایک لامحدود وجود اور ایک بے انتہا کمال ہے۔ اس کا نہ کوئی اندازہ ہے اور نہ ہی کوئی حد ہے۔ اس کے مقابلے میں سب سے زیادہ کمزور موجودات مادی دنیا کا اولین مواد ہیں۔ یہ وہ مواد ہے جس کی بجائے خود کوئی شکل اور صورت نہیں اور یہ شکلیں اور صورتیں اختیار کرتا ہے اور یہ شکلیں اور صورتیں ہی ہیں جو اسے قدر و قیمت بخشتی ہیں کیونکہ شکلوں کے عقب میں ہم نئے نئے اثرات دیکھتے ہیں اور یہ بجائے خود ان کے کمال کی جانب سفر کی دلیل ہے۔

انسان بھی دنیا کے موجودات میں سے ایک موجود ہے جو ترقی کے قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کے کمال کا راستہ نفس کی تہذیب اور ورزش

(ریاضت) ہے۔ عبادت جو کہ خدا کی بارگاہ میں پرستش اور روبسجدہ ہونے سے عبارت ہے بجائے خود سب سے بڑی ریاضت اور تربیت کا بہترین وسیلہ اور کمال کی جانب حقیقی رہنما ہے۔ قرآن مجید سے پتا چلتا ہے کہ عبادت انسان سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کی تمام موجودات فطری طور پر خدا کی پرستش کرتی ہیں اور اس کی تسبیح پڑھتی ہیں۔ خدا کی ایک صفت ان کی ذات کے اندر جلوہ گر ہوتی ہے اور یہ جلوہ انہیں تعظیم پر مجبور کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

"جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں
سب خدا کی تسبیح کرتی ہیں۔"

(سورۂ جمعہ، آیت ۱۔ سورۂ تغابن، آیت ۱)

یہ تسبیح اور ثنا ہم نہیں سن سکتے لیکن قرآن مجید میں رسولِ اکرمؐ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں اور سورج، چاند، ستارے، درخت اور حیوانات سب خدا کو ہی سجدہ کرتے ہیں؟" (سورۂ حج۔ آیت ۱۸)

اور پھر ارشاد ہوا ہے:

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو پرندے صف بستہ ہیں وہ سب نماز اور اس کی تسبیح کا طریقہ بتاتے ہیں۔" (سورۂ نور۔ آیت ۴۱)

یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ "کیا تم نہیں دیکھتے؟" اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں یہ کمال حاصل نہیں کہ کائنات کی گہرائیوں پر نظر ڈال سکیں۔ ہم صرف معتقد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ "کیا تم نے نہیں دیکھا" اور مخاطب رسولِ اکرمؐ ہیں۔ یہ چیز

آنحضرتؐ کے لیے شہود کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اسے دیکھنے سے تعبیر کیا گیا ہے سننے سے نہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمارا کام ایمان لانا اور اعتقاد رکھنا ہے۔

"دنیا کے تمام ذرے پوشیدہ طور پر تم سے دن رات یہ کہتے ہیں کہ ہم سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں اور ہوش رکھتے ہیں لیکن تم نامحرموں کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے۔ جب تم بے جان چیزوں کی طرف جاتے ہو تو جمادات کی روح سے کیونکر واقف ہو سکتے ہو۔ بے جان چیزوں کو چھوڑ کر روح کی دنیا میں جاؤ اور کائنات کے اجزاء کا شور سنو۔ تم جمادات کی تسبیح صاف صاف سن سکو گے اور وہ تاویل کا وسوسہ مٹا دے گی۔ چونکہ تمہاری روح کو روشنی میسر نہیں اس لیے چیزوں کو سمجھنے کے لیے تم نے تاویلیں کی ہیں جب تک انسان حس سے باہر نہیں نکلتا وہ غیب کی تصویر سے بیگانہ رہتا ہے۔"

(مثنوی مولوی)

اس سے پتا چلتا ہے کہ دنیا کے تمام موجودات اپنی ذات کی فطرت اور باطن میں خدا کو دیکھتے ہیں اور انسان بھی دوسرے موجودات کی طرح اپنی فطرت میں خدا کی تسبیح اور ثنا کرتا ہے اور لازمی طور پر اسے جانتا اور پہچانتا ہے۔

ممکن ہے یہاں یہ سوال کیا جائے کہ جب ہر شخص اپنی فطرت کے مطابق خدا کو جانتا اور پہچانتا ہے تو پھر ایک شخص بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو ذاتِ الٰہی کا منکر ہو۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ خدا کے منکر ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ دل میں خدا پر ایمان رکھتے ہوں اور بظاہر انکار کرتے ہوں بلکہ پوری سنجیدگی سے اس کی ہستی سے انکاری ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر خدا کی معرفت فطری چیز ہے تو پھر سوچ بچار یا سلوک اور تزکیۂ نفس کے ذریعے اس معرفت کو حاصل کرنے کی کوئی

ضرورت نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فطری معرفت اور فکری معرفت میں فرق ہے۔ جو معرفت اور آشنائی سب کو حاصل ہے وہ سرشت اور فطرت کی سطح پر ہے اور جو معرفت حاصل نہیں ہے اور اسے کوشش اور عمل سے حاصل کیا جا سکتا ہے وہ سوچ بچار کی سطح پر ہے اور یہی وہ سطح ہے جس پر اکثر انکار کی نوبت آتی ہے یعنی دو سطحوں میں ایک قسم کا تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک بچہ اپنی فطرت اور سرشت کی بنا پر حقیقت کا متلاشی ہوتا ہے اور چھان بین کرتا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد جو چیزیں دیکھتا ہے ان سے واقف ہونا چاہتا ہے۔ یہ شعور اور یہ حس بچے میں ایک شعور اور ایک قسم کی واقفیت کی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ بالخصوص جب کہ اس کی عمر تقریباً تین سال کی ہو جاتی ہے۔ ایک دانشمند کو بچے کے اندر موجود اس حس کا مکمل طور پر پتا چل جاتا ہے اور وہ اس کے وجود کی تصدیق کرتا ہے لیکن خود بچے کو اپنے اندر موجود اس واقفیت کا علم نہیں ہوتا یعنی وہ یہ واقفیت رکھتا ہے لیکن اس کی موجودگی سے واقف نہیں ہوتا اور اکثر اس کی موجودگی سے انکار کرتا ہے بلکہ بچے کی خود اپنے وجود کے بارے میں بھی یہی کیفیت ہوتی ہے یعنی وہ اپنے وجود سے واقف ہوتا ہے لیکن اس واقفیت سے واقف نہیں ہوتا۔ خدا کی معرفت کی بھی بعینہٖ یہی صورت ہے۔ یعنی ہر شخص طبعاً اور فطرتاً خدا کی ذات سے واقف ہوتا ہے لیکن اسے اس واقفیت کا علم نہیں ہوتا۔

اب ہم دوبارہ اصلی مطلب کی طرف لوٹتے ہیں۔ ہمیں یہ پتا چل گیا ہے کہ اطاعت کا نتیجہ خدا کا قرب ہے اور خدا کے قرب سے یہ لازم آتا ہے کہ انسان جوں جوں بلند درجوں پر پہنچتا جائے خدا کی جانب سے اس کے وجود کے کمالات میں جن میں

علم، قدرت اور نفوذ شامل ہیں اضافہ ہوتا جائے۔

عوالمِ ہستی

جو کمال مادی دنیا میں موجود ہو مسلمہ طور پر وہی کمال عالمِ بالا میں زیادہ کامل شکل میں موجود ہوتا ہے۔ جو جسمانی لذتیں ہمیں مادی دنیا میں میسّر آتی ہیں وہ محدود لذتیں ہیں جو زمان، مکان اور کئی ایک دوسری شرائط سے منسلک ہیں انہیں اپنی منافات اور ضد سے گتھم گتھا ہونا پڑتا ہے۔ ہر لذت کے مقابلے میں سیکڑوں موانعات موجود ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک انہیں باطل کرنے کے لیے کافی ہے یا ابتداء سے ان لذتوں کو پیدا ہونے کا موقع ہی نہیں دیتا۔

یہ مزاحمتیں اس دنیا کے مادے کی بنا پر ہیں اور وہی ہے جو ان تضادات کو وجود میں لاتا ہے اور اگر ہم اس دنیا سے نکل جائیں اور مادہ موجود نہ ہو تو یہ تضادات بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ انسان خواب میں دلکش مناظر دیکھتا ہے لیکن اس وقت کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ بالآخر خواب سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خواب دیکھنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور اسی طرح اس کے مرئی وجود یعنی جو چیز خواب میں دیکھی جائے اس میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں۔ آخرکار یہ بحث کی گئی ہے کہ آیا عالمِ رویاء میں جو چیزیں دیکھی جاتی ہیں وہ ادراکی قوتوں کی پیداوار ہوتی ہیں یا ان ادراکی قوتوں سے قطع نظر ایک الگ حقیقت اور ایک مستقل وجود ہوتی ہیں؟ دوسرے لفظوں میں آیا ان کا مرتبہ نفس کا ہے یا اس کے علاوہ ہے؟

بہرحال جو کچھ بھی ہو اور جہاں کہیں بھی ہو ہم دیکھتے ہیں کہ جو چیزیں خواب میں دیکھی جائیں ان میں مادہ، زمان اور مکان نہیں ہوتا اور نہ ہی مادی تضادات

ہوتے ہیں۔ مثلاً یوں بھی ہوتا ہے کہ ہم ایک گھنٹہ سوتے ہیں اور ایک سال خواب دیکھتے ہیں۔ یعنی مسلسل ایسے واقعات دیکھتے ہیں کہ اگر بیداری کی حالت میں رونما ہوں تو انہیں وقوع پذیر ہونے کے لیے ایک سال کی مدت درکار ہو۔ تاہم یہ مناظر زمان، مکان اور مادے سے بے نیاز ہوتے ہیں اور ان کے نتیجے میں لذت یا غم اور دکھ بھی ملتا ہے۔ انسان کبھی بے حد خوش ہوتا ہے اور کبھی غمگین ہو جاتا ہے اور پریشانی کے عالم میں خواب سے بیدار ہو جاتا ہے۔

یہ صورتیں اگر مادے پر واقع ہوتیں تو اپنا اثر چھوڑتیں اور اب بھی جب کہ عالم رویاء میں یہ مادے پر واقع نہیں ہوئیں اور مادے سے الگ ظاہر ہوئی ہیں پھر بھی ان سے وہی آثار وابستہ ہیں۔ یہ تاثیر بجائے خود وجود اور ہستی کی دلیل ہے ورنہ جس چیز کی کوئی ہستی ہی نہ ہو وہ کیونکر اثر پیدا کر سکتی ہیں؟

پس ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ لذت بخش مادی صورتیں مادے کے بغیر بھی موجود اور مؤثر ہو سکتی ہیں اور مسلمہ طور پر یہ مرحلہ زیادہ بلند اور زیادہ کامل ہے۔

تاہم یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ان صورتوں کا بھی حساب اور حدیں ہیں یعنی ہر لذت ہر صورت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم استمتاعی لذت انسان کے چہرے سے حاصل کرتے ہیں اور کھانے پینے کی لذت اشیائے خورد و نوش کی صورتوں سے پاتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا چاہیے کہ یہاں بھی کسی حد تک کثرت اور جدائی کی حکومت ہے اور یہ بھی اس دنیا کے کمال کے ضعف اور کمی کی دلیل ہے۔

اور اس سے بالاتر وہ مقام ہے جہاں حدوں اور اندازوں کا وجود نہیں بلکہ جو کچھ ہے وحدت اور جمع ہے اور کمالات ایک دوسرے سے الگ اور بیگانہ نہیں ہیں اور ہر کمال دوسرے کمال میں گندھا ہوا ہے۔ انسان جو کچھ دیکھتا ہے دوبارہ وہی سنتا ہے اور جو کچھ سنتا ہے دوبارہ وہی دیکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ مرحلہ زیادہ

کامل اور صورتوں اور مثالوں کے مرحلے سے بلند تر ہے۔

اس حساب کی رو سے تین حصے مل کر ساری کائنات کو تشکیل دیتے ہیں یعنی مادیات کی دنیا، صورتوں اور مثالوں کی دنیا اور کامل مجردات کی دنیا جس میں مادیت کو کوئی دخل نہیں اور نہ ہی وہ اس کی حدود سے مربوط ہے۔ ان تینوں درجوں میں سے ہر ایک اپنے سے نیچے والے درجے کے مقابلے میں کامل اور اپنے سے اوپر والے درجے کے مقابلے میں ضعیف اور ناقص ہے۔

دنیا اور انسان کی تدریجی ترقی

عالمِ وجود کی بنیاد اس انداز سے نہیں رکھی گئی کہ ہر موجود اپنی جگہ پر رہے اور ساکن رہے یعنی جہانِ ہستی پر بے حرکتی اور جمود کی حکومت نہیں ہے۔ عالمِ وجود متحرک اور انعطاف پذیر ہے۔ لہٰذا ایک بے جان موجود زندہ ہو جاتا ہے، بڑھتا ہے اور پھل دیتا ہے اور بالآخر ایک کامل تر مرحلے پر پہنچ جاتا ہے۔ کائنات کا نظام مسلسل حرکت اور تدریجی ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور ناقص کامل اور کامل، کامل تر ہو رہے ہیں۔ انسان بھی اس دنیا کے موجودات میں سے ایک ہے اور بے حرکت اور جامد نہیں ہے بلکہ حرکت اور تدریجی ترقی کا اہل ہے۔

انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا مادی دنیا میں کی ہے اور اس کی ہر لذت رنج و الم سے مربوط ہے۔ تاہم وہ اس بات کا اہل ہے کہ ایک بلند تر منزل پر پہنچے جہاں اسے لذتیں نصیب ہوں لیکن ان کے ساتھ رنج و الم کی آمیزش نہ ہو جو کہ مادے سے پیدا ہوتا ہے اور پھر اس مرحلے سے بھی اوپر جائے جہاں صورتیں اور مثالیں نہ ہوں۔ جہاں پورا پورا کمال، قدرت، سرور اور نیک بختی ہو۔ یہ وہ مقام ہے جہاں وہ ذاتِ حق سے پیوست ہو جاتا ہے:

"بے شک (سب کو) تمہارے پروردگار کی طرف پلٹنا ہے۔"

(سورۂ علق۔ آیت ۹)

یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک دوسرا انسان جو مادی چیزوں سے انس اور محبّت رکھتا ہو۔ اسے اس دلدل سے نکالنے کی خواہ کتنی کوشش کی جائے وہ پھر مادے کی طرف لوٹ جاتا ہے اور یا وہ اپنی ذات اور فطرت کے تقاضے کے مطابق کتنا ہی اس سے باہر نکلنے کی خواہش کرے لیکن جو پست اور بری صفات اس میں پیدا ہوگئی ہوں وہ اسے پھر مادے کی جانب واپس لے جاتی ہیں اور قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق:

"وہ جب اس میں سے نکل جانے کا ارادہ کریں گے تو پھر اسی میں دھکیل دیے جائیں گے۔" (سورۂ سجدہ۔ آیت ۲۰)

کیونکہ اس کی ذات اور اس کی روح کی گہرائی آتشی اور مادی ہو جاتی ہے اور اس کی فطرت بھی ایسی ہی ہو جاتی ہے۔

اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے لوگوں کے درجے

لوگ اپنے اعتقادات اور اعمال کے لحاظ سے مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ برائیوں میں مبتلا ہیں لیکن ان کے اعتقادات صحیح ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے عقائد بھی درست نہیں اور وہ ہر لحاظ سے نقصان میں ہیں۔ قرآن مجید انہیں سخت قابلِ نفرین اور پست شمار کرتا ہے۔ (سورۂ فرقان اور سورۂ مدّثّر آیت ۵۰) اور بنیادی طور پر وہ بحث کے دائرے

سے خارج ہیں۔

جہاں تک باایمان اور صالح لوگوں کا تعلق ہے ان کے تین طبقے ہیں:

۱۔ وہ لوگ جو عبادت کرتے ہیں لیکن دنیاوی خواہشات اور لالچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ انہیں فقط لذّت حاصل کرنے کی فکر رہتی ہے۔ یہ لوگ جو عبادت انجام دیتے ہیں وہ جسمانی لذتوں کی خاطر ہوتی ہے اور اگر ان کے حالات کی خوب چھان بین کی جائے تو پتا چلتا ہے کہ وہ درحقیقت جسمانی لذتوں کے عاشق ہیں اور اپنے نفس کی خواہشات کے پیچھے بھاگتے ہیں لیکن وہ دیکھتے ہیں کہ دنیاوی لذتیں فانی اور بے مایہ ہیں اور انہیں بقا اور دوام حاصل نہیں۔ ہر لذت کے ساتھ کوئی نہ کوئی غم اور دکھ لگا ہوا ہے۔ پس اگر دنیا جاودانی ہوتی اور اس کی لذتوں میں رنج والم کی آمیزش نہ ہوتی تو ان لوگوں کا اصلی مقصد پورا ہو جاتا اور اس کے علاوہ انہیں کسی چیز کی ضرورت نہ ہوتی لیکن وہ کیا کریں کہ دنیا جاودانی نہیں ہے اور اس کی لذتیں رنج اور دکھ سے خالی نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ آخرت کے پیچھے بھاگتے ہیں تاکہ دکھ اور درد کے بغیر جسمانی لذتیں حاصل کرنے کا ان کا مقصد پورا ہو جائے۔ ان لوگوں کا نفس مادی اور جسمانی مرحلے سے آگے نہیں بڑھا۔ انہوں نے اس منزل سے آگے قدم نہیں رکھا اور جسم کے کمال سے بڑھ کر کسی کمال کی خواہش نہیں کی یا انہیں بنیادی طور پر اس سے برتر کمال کا پتا ہی نہیں چلا اور وہ کسی ایسے کمال کے معتقد ہی نہیں ہوئے۔

۲ دوسرے طبقے میں وہ لوگ شامل ہیں جو جہنم کی آگ سے بچنے کی خاطر عبادت بجالاتے ہیں۔ ان لوگوں کا مقصد بھی جسم کے مرحلے سے بلند تر نہیں ہے اور درحقیقت انہوں نے اپنی نفسانی خواہشات کے حصول کیلئے خدا کو واسطہ قرار دیا ہے اور

ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے عبادت کو خدا کا قرب حاصل کرنے کا وسیلہ بنایا ہو۔ پس فی الحقیقت وہ اپنی خواہشات کی تعظیم کرتے ہیں اور اسکے آگے سجدے بجالاتے ہیں۔ کیونکہ وہی ان کی محبوب ہیں اور چاہنے والا محبوب تک پہنچنے کے وسیلے کے سامنے نہیں بلکہ اپنے محبوب کے سامنے کورنش بجالاتا ہے۔

۳۔ تیسرے طبقے سے ان لوگوں کا تعلق ہے جن کا حقیقی مقصد خدا کی عبادت کرنا اور اس کا شکر بجالانا ہے۔ وہ اس مادی دنیا سے اپنا تعلق منقطع کر لیتے ہیں اور عالم بالا کی سیر کرتے ہیں۔ وہ بلبل کی مانند ہیں جس کے دل میں گلاب کے حسن کی محبت کے سوا کوئی چیز تحریک پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ خدا کے حضور میں رکوع اور سجدے بجالاتے ہیں۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا وہ نہج البلاغہ کی حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے اور ایک ایسی روایت ہے جو امام صادقؑ سے نقل کی گئی ہے۔[۱]

خداوند تعالےٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

"میں نے جنوں اور انسانوں کو کسی مقصد کے لیے پیدا نہیں کیا بجز اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔" (سورۂ ذاریات۔ آیت ۵۶)

عبادت اور پرستش 'توجہ اور تذلل' ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوق کا آخری ہدف جو ہر موجود کا آخری کمال بھی ہے۔ خدا کی عبادت کرنا اور اس کی جانب متوجہ ہونا ہے اور درحقیقت ان کے وجود کا ہدف خود خدا کی ذات ہے اور عبادت اس ہدف تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ عبادت خود اصلی ہدف نہیں ہے۔

خدا پھر فرماتا ہے:

---

[۱] نہج البلاغہ، حکمت ۲۲۹ اور خصال صدوق، تیسرا باب۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ فَادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۝

(سورۂ مومن - آیت ۶۵)

"اخلاص" کا مادہ "خلاص" ہے اور اس کے معنی کسی چیز کو آلودگی سے پاک کرنے کے ہیں۔ اس آیت کی ترتیب بہت خوبصورت واقع ہوئی ہے کیونکہ 'اللہ' کے معنی معبود کے ہیں۔ پہلے تو یہ آیت بتاتی ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی پرستش کے لائق نہیں اور پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس سے دعا مانگو اور دین کو ــــ جو انسان کے معنوی توجہات سے عبارت ہے ــــ اس کی خاطر غیروں سے پاک کرو اور فقط اسی کی طرف نگاہ ڈالو۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ:

رسول اکرمؐ اس قدر روئے کہ رو رو کر بے حال ہو گئے۔ لوگوں نے کہا:

"کیا خدا نے سورۂ فتح میں یہ نہیں فرمایا کہ اس نے آپ کے تمام سابقہ اور آئندہ گناہ بخش دیے ہیں؟"

آنحضرت نے جواب میں کہا:

"کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟"[1]

شکر اچھائیوں اور خوبصورتیوں پر تعریف کرنا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کی حقیقت خدا کی جانب توجہ کرنا اور اس کی تعریف کرنا ہے کیونکہ وہ جمیل ہے۔

خواجہ حافظ فرماتے ہیں:

ایک بلبل گلاب کی ایک خوبصورت پتی چونچ میں پکڑے ہوئے

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب

تھی اور اس سازوسامان کے ساتھ نالہ وفریاد کر رہی تھی۔
میں نے اس سے پوچھا کہ عین وصل کی حالت میں اس آہ وزاری کے کیا معنی ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ معشوق کے جلوے نے یہ کام میرے سپرد کیا ہے۔"

اس قسم کی عبادت حصار کو توڑنے اور جسم اور جسمانی دنیا سے باہر جست لگانے سے پیدا ہوتی ہے اور یہی قدس اور معنویت کی دنیا میں انسان کا حقیقی سفر ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا دل اور روح عشق و محبت سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ وہ وحدت اور خدائے احد کے سوا کچھ نہیں دیکھتا اور اس کی بارگاہ میں ہر چیز فراموش کر دیتا ہے اور فقط دل اور جان اس کے سپرد کر دیتا ہے۔

خدا کی معرفت کے راستے

خدا کی معرفت اور اس تک پہنچنے کی دو قسمیں ہیں:
کبھی یہ وصال فکری اور خیالی ہوتا ہے اور کبھی شہود اور رویت قلبی ہوتا ہے۔ بہت سی روایات میں فکری وصال کو معرفت نہیں گردانا گیا اور حقیقی معرفت کو اس سے نفی کر دیا گیا ہے کیونکہ اس صورت میں درحقیقت انسان کی توجہ اپنے ذہنی خیالات کی جانب ہوتی ہے اور وہ اپنے ادراک کی بنائی ہوئی چیز کی پرستش کرتا ہے۔

جہاں تک روایت کا تعلق ہے یہ امر مسلّم ہے کہ خدا کو دیکھنا ناممکن ہے لیکن اس قول کا اطلاق آنکھوں سے دیکھنے پر ہوتا ہے اور یہ بات (کہ خدا کو آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے) مسلمانوں کے کچھ فرقوں کے علاوہ کسی نے نہیں کہی۔ باقی اسلامی

فرقے اور اسی طرح بہت سے غیر مسلم مذاہب بھی خدا کو رویت سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ عقل اس رائے کی سب سے بڑی موید ہے کیونکہ خدا زمان اور مکان میں نہیں سماتا تاکہ آنکھ اس کا احاطہ کرسکے اور اسے دیکھ سکے۔

لیکن جو کچھ عارف لوگ کہتے ہیں ــــ اور روایات اور آیات سے بھی اس کے علاوہ کچھ پتا نہیں چلتا ــــ وہ یہ ہے کہ خدا کی رویت شہودی ہے یعنی ہم خدا کو نہ تو محدود کر سکتے ہیں اور نہ اس کا اندازہ مقرر کر سکتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح ہر موجود کے باہر خدا ہے اسی طرح اس کے اندر اور اس کی روح کی گہرائیوں میں بھی خدا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ:

"ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔"

(سورۂ قٓ۔ آیت ۱۶)

یہ نزدیکی مکانی نزدیکی نہیں ہے بلکہ واقعی اور حقیقی قرب اور انصال ہے اور اگر ممکن موجودات (اور ذاتِ الٰہی کے علاوہ سبھی ممکن ہیں) شہود کے اس مرتبے سے جدا ہو جائیں تو پھر وہ ممکن نہیں رہیں گے بلکہ خود مستقل موجود بن جائیں گے اور خدا سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ اصولاً مخلوق ہونے کے معنی یہ ہیں کہ موجود کی ہستی اور اس کی ذات کے باطن کی بنیاد ہستی بخشنے والے یعنی خدا کے ساتھ وابستہ ہو۔ جس طرح انسانی ذہن کی بنائی ہوئی شکلیں توجہ دینے سے موجود رہتی ہیں اور ذرا سی غفلت برتی جائے تو ذہن کی لوح سے نابود ہو جاتی ہیں۔ وہی حیثیت خدا کی عظمت کے سامنے جہانِ ہستی کی ہے کیونکہ وہ اس کی مخلوق اور معلول ہے۔

جس چیز کی ضرورت ہے وہ اس شہودی کیفیت کا علم اور اس کی جانب

توجہ دینا ہے۔ اس سے مراد ذہنی یاد داشت نہیں ہے بلکہ خدا کے ساتھ واقعی ارتباط کے سمجھنے اور اس ارتباط تک حقیقی معنوں میں پہنچنے کے ہیں اور یہ وہ چیز ہے جو تدریجی ترقی اور عبادت کا راستہ طے کیے بغیر (ان معنوں میں جن میں عبادت کی حقیقت بیان کی گئی ہے) کسی کو میسر نہیں آسکتی۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

"جو شخص اپنے پروردگار سے ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ اچھے کام کرے۔" (سورۂ کہف۔ آیت ۱۱۰)

پھر ارشاد ہوا ہے:

"ہم عنقریب اپنی نشانیاں اطرافِ عالم میں اور خود ان کے باطن میں انہیں دکھا دیں گے تاکہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ وہی حق ہے۔ کیا تمہارا پروردگار کافی نہیں جب کہ وہ ہر چیز پر شہید ہے۔ یہ لوگ اپنے پروردگار کے روبرو حاضر ہونے کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔ وہ یقیناً ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔"

(سورۂ حٰم سجدہ۔ آیات ۵۳-۵۴)

لفظ "شہید" شہادت سے نکلا ہے جس کے معنی معاینہ اور موجودگی کے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ میں شاہدِ مجلس تھا، یعنی میں مجلس میں موجود تھا اور میں نے اس کی کیفیت اور وضع ملاحظہ کی یا یہ کہا جاتا ہے کہ 'میں فلاں واقعہ کا شاہد ہوں'، یعنی اس کا وقوع پذیر ہونا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

ممکن ہے یہاں شہید ان معنوں میں ہو کہ خدا ہر چیز کا مشاہدہ کرتا ہے اور کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان معنوں میں ہو کہ تمام موجوداتِ عالم خدا کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اسے دیکھتے ہیں۔ اس صورت

ہیں شہید مشہود کے معنوں میں ہو گا۔

اس حصّے میں سیاق اور کلام کا انداز دوسرے معنوں کی تائید کرتا ہے کیونکہ یہ آیات توحید اور خدا کی صفات کے بارے میں نہیں ہیں تاکہ وہ فرمائے کہ اس کی صفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ہر چیز پر شاہد ہے بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ خدا لوگوں کو فطرت سے آشنا کرے اور یہ چیز قدرتی طور پر پہلے معنوں کے مقابلے میں دوسرے معنوں سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے اور دوسری آیت میں خدا سے ملاقات کے منکرین کو فقط اتنا جواب دیا ہے کہ اس کی ذات ہر شے پر محیط ہے یعنی جب صورت یہ ہے کہ خدا ہر چیز پر محیط ہے اور کوئی چیز اس کے بغیر نہیں ہے تو وہ اس سے ملاقات کے بارے میں کیسے شک کرتے ہیں؟

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ 'لقاء' سے مراد موت ہے لیکن اگر مراد موت ہوتی تو منکرین کو یہ جواب دینے کے کوئی معنی نہ ہوتے کہ خدا ہر شے پر محیط ہے اور اس کے بھی کوئی معنی نہ ہوتے کہ موت کی توضیح احاطۂ خدا سے کی جائے اور اس پر استدلال کیا جائے۔

امام حسین علیہ السلام دعائے عرفہ میں فرماتے ہیں:

"کیا تیرے سوا کوئی ایسا ظہور اور جلوہ رکھتا ہے کہ تجھے ظہور دے اور تیری دلیل ہو۔ اندھی ہے وہ آنکھ جو تجھے اپنا شاہد نہ سمجھے اور نقصان وہ ہے وہ عشق جسے تو نے اپنی محبت سے بہرہ مند قرار نہ دیا ہو۔"

لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت زیادہ جلوہ گری پوشیدہ ہو جانے کا موجب بن جاتی ہے۔

اس حقیقت یعنی خدا کے واقعی شہود کی واقعیت کی بنا پر انسان نے

اپنی ذہنی یادداشتوں اور اپنے ادراک کی بنائی ہوئی چیزوں سے ایک قدم آگے بڑھایا ہے — یعنی خیال سے آگے حقیقت کی جانب — خدا کو واقعاً پایا ہے۔

انسان کے کمال کے سفر کا راستہ یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اور ہر چیز کے مقابلے میں خدا کو دیکھنے والا اور اس کی ذات سے ملحق ہو اور اسی مشاہدے میں وہ تمام خوبصورتی اور جمال دیکھتا ہے اور جب انسان کے اندر عشق کے شعلے بھڑکتے ہیں تو وہ خدا کے ساتھ خلوت کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ اگر وہ کسی چیز سے محبت کرتا ہے تو اسی کی خاطر کرتا ہے اور اگر کسی چیز سے نفرت کرتا ہے تو وہ بھی اسی کی خاطر کرتا ہے۔ اگر وہ دنیا سے آزردہ خاطر ہے تو اس لیے کہ خدا اس سے متنفر ہے اور اگر وہ آخرت کی طرف مائل ہے تو اس لیے کہ خدا اسے پسند کرتا ہے اور اس لیے نہیں کہ اس میں اس کے جسم کے لیے دائمی لذّت کا سامان موجود ہے۔

اپنے آپ کو پانا

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہر جگہ خدا کے علاوہ کسی دوسرے کی جانب توجہ دینے کی مذمت کی گئی ہے اور انسان کو اس سلسلے میں خبردار کیا گیا ہے لیکن جب انسان کے نفس اور روح کی نوبت آئی ہے تو اسے ان کی جانب توجہ دینے کی ترغیب دی گئی ہے۔

ارشاد باری تعالےٰ ہے کہ :

"ان لوگوں جیسے نہ بنو جو خدا کو بھلا بیٹھے ہیں اور خدا نے بھی انہیں ایسا کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے۔ وہ لوگ خود بدکردار ہیں۔" (سورۂ حشر۔ آیت ۱۹)

درحقیقت یہ آیت اس مشہور حدیث نبوی کے منفی پہلو سے متعرض ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔"

اسی طرح حدیث نبوی آیت شریفہ کے اثباتی پہلو سے متعرض ہے اور علمی اصطلاح میں کہنا چاہیے کہ یہ آیت اور حدیث نبوی ایک دوسری کا "عکسِ نقیض" ہیں۔

خداوند تعالیٰ پھر ارشاد فرماتا ہے کہ:

"اے ایمان والو! تمہیں چاہیے کہ اپنے آپ کو پالو۔ جب تم راہِ راست پر ہو تو کوئی گمراہ ہونے والا تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" (سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۰۵)

اسی طرح اور بہت سی آیات ہیں جن میں انسان کے نفس اور اس کی روح کی حقیقت کو اس کی خوش بختی کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ ان آیات میں نفس کی جانب توجہ کو خدا کی جانب توجہ گردانا گیا ہے یعنی انسان اپنے باطن کی طرف راغب ہو اور اپنی توجہ اپنی روح پر مرکوز رکھے اور جو کچھ غیر ہے مثلاً چیزوں کا عدم یا فقدان، تعلقات، وابستگیاں ــــ اپنے آپ سے وابستگی اور دوسروں سے وابستگی ــــ ان سب سے آنکھیں بند کرے اور سب کو اپنی توجہ کے دائرے سے نکال باہر کرے اور فقط ہستی کو اور وجود مطلق کو دیکھے کیونکہ یہی دیدار شہودِ الٰہی، عرفانِ حقیقی اور انسان کے کمال کے سفر کا آخری مرحلہ ہے۔

اور یہ ایسی چیز ہے جو شرعی ریاضتوں کے بغیر یعنی نفس کو رذائل اور گناہ سے پاک کرنے اور اسے فضائل اور حقیقی عبادت سے (جس کی تشریح اوپر

کی گئی ہے) سجانے کے بغیر کسی شخص کو میسر نہیں آسکتی۔

ریاضت کا قوت بخشنا

ریاضت جتنی کی جائے قطعی طور پر کمال بخشتی ہے اور انسان کے نفس کو تقویت پہنچاتی ہے اور قوت دیتی ہے۔ مثلاً بڑی سخت ریاضتوں کے نتیجے میں تارک الدنیا لوگوں کا نفس اپنے باطن سے باہر کی دنیا میں تصرف کی قوت پیدا کر لیتا ہے اور یہ ایسی چیز نہیں جو کسی کے لیے قابلِ انکار ہو۔

لیکن یہ ریاضتیں شرعی ریاضت کے مقابلے میں بڑی حد تک آسان ہیں کیونکہ دینی اعمال اور آداب دائمی ہدایات کا ایک سلسلہ ہیں جن کا اپنی زندگی کے آخری لمحے تک بجالانا انسان کا فرض ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر جگہ اور ہر وقت اپنی نفسانی خواہشات کو کچل دے۔ اس کے برعکس وہ ریاضتیں کچھ مدت کے لیے ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ایسی ریاضتیں ہیں جو انسان کی فطرت اور خلقت کے برخلاف ہیں اور فطرت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں لیکن اسلامی ریاضتیں نہ صرف یہ کہ فطرت کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتیں بلکہ درحقیقت ان کی بنیاد ہی فطرت اور اس کی نشوونما پر رکھی گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تارک الدنیا لوگوں کے نفس کی قوت بے حد معمولی ہوتی ہے اور زمان اور مکان کے نقطۂ نگاہ سے مکمل طور پر محدود ہوتی ہے اور وہ ایک خاص وقت یا خاص مقام پر غیب کی خبریں دے سکتے ہیں یا تصرف کر سکتے ہیں لیکن اولیاء اللہ کا تصرف کرنا یا غیب کی خبریں دینا کسی مخصوص وقت اور مقام تک محدود نہیں ہے اور یہ ایک قدرتی امر ہے کہ تصرف کا دائرہ جتنا

وسیع ہوگا نفس کی قدرت اور اس کے وجود کی وسعت بھی زیادہ ہوگی۔

حدیثِ قدسی میں جو فریقین نے نقل کی ہے اور شاید متواتر اسلامی احادیث میں سے ہے اور اس کے رسولِ اکرمؐ سے صادر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے یوں فرمایا گیا ہے کہ بندہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جب اس کا کام خداوندی کام ہوتا ہے اور اس کا ارادہ مراد برلانے والا ہوتا ہے اور اس کی خواہش، خواہش کو جنم دیتی ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ:

رسول اکرمؐ نے کہا کہ خدائے عزوجل نے فرمایا: "بندہ ایک ایسا عمل بجالانے سے جو میں نے اس پر واجب کر دیا ہے میرے نزدیک نہیں ہوتا تاکہ وہ مجھے زیادہ محبوب ہو لیکن وہ نافلہ بجالانے سے میرے اس قدر نزدیک ہو جاتا ہے کہ میں اسے دوست رکھتا ہوں اور چونکہ میں اسے دوست رکھتا ہوں اس لیے اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بات کرتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اگر وہ مجھے پکارتا ہے تو میں اسے جواب دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں وہ چیز اسے بخش دیتا ہوں۔" [1]

یہ روایت سند اور راویوں کے لحاظ سے معتبر اور قابلِ اطمینان ہے۔

---

[1] اصول کافی۔ جلد ۲ صفحہ ۳۵۲

اس حدیث کے دو پہلو ہیں۔ ایک خدا کی بندے سے دوستی ہے اور دوسرا یہ ہے کہ بندے کا عمل خدائی عمل ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید بھی ان دونوں پہلوؤں کی تصدیق کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے:

"(اے رسول! ان لوگوں سے) کہہ دیجیے کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تا کہ خدا بھی تمہیں دوست رکھے اور تمہارے گناہ بخش دے۔" (سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۳۱)

اور پھر فرماتا ہے:

"اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور اس کے رسول (محمدؐ) پر ایمان لاؤ تا کہ خدا تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا فرمائے اور تمہیں ایک ایسا نور عطا فرمائے جس کی روشنی میں تم چل سکو۔" (سورۂ حدید۔ آیت ۲۸)

اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ ایمان اور نیک اعمال سے ایک الٰہی نور حاصل ہوتا ہے جس کے وسیلے سے مومن شخص لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے اور ان کے ساتھ زندگی گزارتا ہے اور حالانکہ وہ پہلے بھی راستہ چلتا تھا اور لوگوں سے میل جول رکھتا تھا لیکن پہلے وہ یہ کام نفس کی قوتوں اور اس کے آلات سے لیتا تھا اور اب ان کی جگہ الٰہی نور نے لے لی ہے اور وہ یہ کام اس کے وسیلے سے کرتا ہے۔

اس آیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ جو کچھ مقرب بندہ چاہتا ہے خدا اسے دیتا ہے اور خواہشات اس کی خواہش سے جنم لیتی ہیں۔ خدا یہ پسند نہیں کرتا کہ جس چیز کو اس کا بندہ پسند نہ کرے وہ واقع ہو بلکہ جس چیز کو وہ پسند کرتا ہے اور اس کا ارادہ کرتا ہے خدا بھی اسی کو پسند کرتا ہے اور وہی وقوع پذیر ہوتی ہے یعنی یہ اس کا ارادہ ہے جو اس کی مراد کو خارجی دنیا میں وجود میں لاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں چیزوں کی پیدائش کی وجہ اس کی خواہش ہے اور وہی ہستی بخشتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے ولایتِ تکوینی کا نام دیا جاتا ہے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ قرآن مجید میں بعض چیزوں کی ایجاد کو حضرت عیسٰی سے منسوب کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ:

"میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے یہ نشانی لیکر آیا ہوں کہ میں مٹی سے ایک پرندے کی شبیہ بناؤں گا اور پھر اس پر پھونکوں گا تو وہ خدا کے حکم سے اڑنے لگے گا اور میں خدا ہی کے حکم سے اندھے اور کوڑھی کو اچھا کروں گا اور مردوں کو زندہ کروں گا اور جو کچھ تم کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو میں وہ سب تم کو بتا دوں گا۔" (سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۴۹)

ان آیات میں حضرت عیسٰی نے پرندے کی تخلیق اور دوسری باتوں کو اپنے آپ سے نسبت دی ہے اور فرمایا ہے کہ میں یہ کام کرتا ہوں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میں خواہش کرتا ہوں اور خدا کام کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کام میں خود کرتا ہوں بجز اس کے کہ خدا کے اِذن سے کرتا ہوں۔

یہاں اِذن کے معنی لفظی اجازت کے نہیں ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ خدا انسان کے باطن کو رحمت اور قوت سے لبریز کر دیتا ہے اور اس کے ارادے اور خواہش کو موثر اور تخلیق کنندہ بنا دیتا ہے۔

قرآن مجید ایک اور مقام پر اس موضوع پر یوں ارشاد فرماتا ہے:

جب خدا نے کہا: "اے مریم کے بیٹے عیسٰی! میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری ماں پر نازل کی ..... اور اس وقت کو یاد کرو جب تم نے میرے اذن سے مٹی سے پرندے

کی ایک شبیہہ بنائی اور اس میں میرے اِذن سے پھونکا اور میرے اِذن سے وہ اڑنے لگا اور میرے اذن سے تم نے اندھے اور کوڑھی کو شفا دی اور اس وقت کو بھی یاد کرو جب تم نے میرے اذن سے مردوں کو زندہ کیا۔" (سورۃ مائدہ۔ آیت ۱۱۰)

یہاں بھی قرآن مجید یہ نہیں کہتا کہ (ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ عیسیٰ کی) نبوّت اور رسالت ثابت کرنے کے لیے ہم نے پرندے کو پیدا کیا یا اندھے اور کوڑھی کو شفا دی یا مردوں کو زندہ کیا بلکہ فرمایا گیا ہے کہ "تم نے پیدا کیا، شفا دی اور زندہ کیا لیکن ہمارے اِذن کے ساتھ" پس ایجاد اور خلقت کو واضح طور پر حضرت عیسیٰ سے منسوب کیا گیا ہے اور یوں انہیں ایک پیدا کرنے والے کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے۔

سوال

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ حدیثِ قدسی میں مقرب بندے کے مطلوب کی خلقت کو خدا تعالیٰ سے منسوب کیا گیا ہے کیونکہ کہا گیا ہے کہ "اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں وہ چیز اسے بخش دیتا ہوں۔"

جواب

یہ چیز اس بات کے منافی نہیں ہے کہ درحقیقت بندے کے مطلوب کی پیدائش خود اس کے ارادے کے زیرِ اثر ہو۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ قرآن مجید میں دنیا کے بہت سے حوادث کو براہِ راست اللہ تعالےٰ سے منسوب کیا گیا ہے حالانکہ ان کی پیدائش کئی ایک مادی اسباب کی بدولت ہوتی ہے یا کئی ایک دوسری وجوہ کارفرما ہوتی ہیں۔

مثلاً قرآن مجید کی بہت سی آیات میں مینہ برسنے اور آسمان سے پانی کے نزول کو براہِ راست حق تعالےٰ سے نسبت دی گئی ہے اور اکثر فرمایا گیا ہے کہ:

"ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا۔"

یا یہ کہ:

"اور اس نے آسمان سے پانی نیچے بھیجا۔"

اور ایک اور مقام پر مادی اسباب کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور ارشاد ہوا ہے کہ:

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ خدا ہی ابر کو چلاتا ہے۔ پھر وہی اسے باہم جوڑتا ہے۔ پھر وہی اسے تہ بہ تہ رکھتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ بارش اس کے درمیان سے نکلتی ہے۔"

(سورۂ نور۔ آیت ۴۳)

یا مثلاً ایک مقام پر موت اور روح کے قبض کرنے کو خدا سے نسبت دی گئی ہے اور ارشاد ہوا ہے کہ:

"خدا ہی نے تمہیں پیدا کیا اور پھر وہی تمہیں موت دے گا اور دنیا سے اٹھالے گا (سورۂ نحل۔ آیت ۷۰)

اور ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے کہ:

"(اے رسول! ان لوگوں سے) کہہ دیجیے کہ ملک الموت جو تم پر تعینات ہے وہی تمہاری روحیں قبض کرے گا۔"

(سورۂ سجدہ۔ آیت ۱۱)

یہ مطلب ایک قرآنی حقیقت ہے۔ قرآن مجید جہاں حوادث کو ان کے

اسباب سے نسبت دیتا ہے۔ وہاں انہیں خدا سے بھی منسوب کرتا ہے اور علم اور فلسفہ بھی اس چیز کو بطور ایک مسلمہ فطری حقیقت کے تسلیم کرتے ہیں کہ جو مظاہر وجود رکھتے ہیں وہ جہاں اپنے اسباب کا سہارا لیتے ہیں وہاں ذاتِ حق کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں سابقہ پیغمبروں کے بہت سے معجزوں کو براہِ راست خدا سے نسبت دی گئی ہے حالانکہ پیغمبروں کے معجزے ایک دوسرے سے متفاوت نہیں۔ سبھی معجزے ہیں اور سب کی پیدائش میں نبی کا پاک و پاکیزہ نفس موثر ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً حضرت عیسیٰؑ کے سلسلے میں کہا گیا کہ تم نے یہ یہ کام ہمارے اذن سے کیے اور حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ :

"ہم نے فرمایا: اے آگ تو ابراہیمؑ پر بالکل ٹھنڈی اور سلامتی کا باعث ہو جا" (سورۂ انبیاء۔ آیت ۶۹)

زیر بحث روایت میں بھی یہی صورت ہے۔ حالانکہ بندے کا ارادہ کسی چیز کو ایجاد کرتا ہے اور اسے پیدائش عطا کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ فعل خدا کا فعل ہے اور درحقیقت خدا سے تعلق رکھتا ہے جیسا کہ درحقیقت خود بندے سے تعلق رکھتا ہے جیسے کہ تمام موجوداتِ عالم خواص اور آثار کے مالک ہیں اور اپنے خواص اور آثار کی نسبت سے سبب اور خالق ہیں یعنی واقعی اپنے خواص کو جنم دیتے ہیں اور ایجاد کرتے ہیں۔

مثلاً جاندار موجودات کئی ایک افعال اور حرکات انجام دیتے ہیں اور انہیں وجود میں لاتے ہیں یعنی ہستی اور وجود کا میدان ان افعال اور حرکات سے خالی ہوتا ہے اور بعد میں وہ اس میں رونما ہوتے ہیں۔ جب انسان کا ہاتھ لکھتا ہے تو لکھائی کا قائم رہنا انسان کا معلول نہیں بلکہ اس رنگ اور روشنائی کا نتیجہ ہے جس سے لکھا گیا ہے یا اس جسم کی حالت کا نتیجہ ہے جس پر لکھا گیا کہ وہ سیال نہیں بلکہ ثابت

ہے لیکن خود ہاتھ کی حرکت انسان کا معلول ہے اور وہ اسے وجود میں لایا ہے۔

یہاں بھی ہاتھ کی حرکت انسان کا ارادی فعل ہے اور انسان سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ خدا کی ذات سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ مختصراً یہ کہ جیسا کہ ہم موجودات کے آثار اور خواص کے سلسلے میں ایجاد اور خلاقیت کو خود ان سے نسبت دیتے ہیں اور اشاعرہ کی طرح نہیں ہیں کہ موجودات کو ان کے آثار اور خواص کے لحاظ سے خدا کے فعل اور ایجاد کے آلات کی مانند سمجھیں اسی طرح معجزوں کے بارے میں بھی ہم خلاقیت کو خود انبیاء سے نسبت دیتے ہیں اور انہیں فقط آلات نہیں سمجھتے۔

ولایت سے انکار کا اشعری کے عقیدۂ جبر سے ارتباط

اشاعرہ ایجاد اور خلقت کو خدا کے علاوہ کسی دوسرے سے منسوب کرنے کو توحید کے خلاف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

"دنیا میں ہر فعل براہِ راست خدا کا فعل ہے اور اسکی ایجاد ہے اور موجودات فقط آلات کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً آرہ لکڑی کاٹنے کا ایک آلہ ہے اور درحقیقت کاٹنا بڑھئی کا کام ہے۔ آرہ اس کام کو انجام دینے کا فقط ایک آلہ ہے اور کسی طرح بھی 'کاٹنا' اس سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ساری کائنات کے حوادث اور حرکات ___ پرہیزگار کی اطاعت سے لیکر گنہگار کے گناہ اور مخالفت تک ___ سب کے سب فقط خدا کا فعل ہیں۔ مختصراً یہ کہ فعل اور ایجاد کے معاملے میں غیرِ خدا فاعل نہیں

ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ پرہیزگار اطاعت کا آلہ ہے اور گنہگار گناہ کا آلہ ہے۔

تاہم یہ خیال انسان بلکہ بے زبان اور بے شعور حیوانات کی فطرت کے بھی خلاف ہے۔ مولانا رومی نے اپنی مثنوی کے پانچویں دفتر میں اس مسئلے پر بحث کی ہے اور انصاف یہ ہے کہ اس پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ خیال عقلِ سلیم اور فطرت کے خلاف ہے اور حیوانات بھی اس چیز کو سمجھتے ہیں۔ اگر ایک انسان ایک اونٹ یا کتے کو مارے تو وہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ انسان اس 'مارنے' کو وجود میں لایا ہے اور اس نے انہیں تکلیف پہنچائی ہے۔ لہٰذا انہیں اس پر غصہ آتا ہے اور وہ اس پر حملہ کرتے ہیں حالانکہ وہ اس لاٹھی یا پتھر پر حملہ نہیں کرتے جو ان کے بدن کو لگتا ہے اور نہ ہی اس پر غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انسان کی حیثیت آلے کی نہیں بلکہ وہ خود اس فعل کو وجود میں لایا ہے۔

یہ طرزِ فکر معقول پسندی کی دینداری سے جدائی کی پیداوار ہے اور ریاکارانہ تقدس کا مظہر ہے جو دین کی حقیقت سے دور ہے۔ قرآن مجید خود' فطرت اور عقل کی طرح انسان کے افعال اور دوسرے موجودات کی خاصیتوں کو ان سے متعلق سمجھتا ہے لیکن یہ صاحبان اس مسلمہ قرآنی حقیقت کی تاویل کرتے ہیں اور اپنے اس اندازِ فکر کو کمال توحید اور یگانہ پرستی گردانتے ہیں۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہر علت اپنے معلول اور تخلیق کردہ چیز کے بارے میں ایجاد کی قدرت رکھتی ہے اور ہم اسے "ولایت تکوینی" (یعنی ایک موجود کا دوسرے موجود پر واقعی اور حقیقی تسلط)

کا نام دیتے ہیں۔ نیز یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ خدا نے موجودات میں سے ہر ایک کو اس کے وجود کی وسعت کے مطابق اس قسم کی ولایت سے حصّہ دیا ہے۔ اگرچہ اس کی عظمت کے مقابلے میں ان کا حصّہ اور نصیب بے حد تھوڑا اور ناچیز ہے اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ انسان کی ایجاد کی قوّت اس کے نفس کے ارتقا کے متوازی ہے اور روح شرعی اور بعض اوقات غیر شرعی ریاضتوں کے نتیجے میں جتنی طاقتور ہوتی ہے اتنی ہی انسان کی قوّتِ ایجاد بڑھ جاتی ہے اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ولایت تکوینی کے عام اصول کا انکار یا بالفاظِ دیگر خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے فاعلِ حقیقی ہونے سے انکار "جبر" پر اعتقاد کا موجب ہے۔

اشاعرہ کے طرزِ فکر کا دوسرے اسلامی فرقوں پر اثر

اہلِ سنت میں اشعری[۱] کے طرزِ فکر کے بہت سے طرفدار تھے اور ان کی تقریباً اکثریت اسلامی عقائد اور معارف کے بارے میں اس کے

---

[۱] ابوالحسن اشعری (۲۷۰ھ - ۳۲۰ھ) ابوعلی محمد ابن عبدالوہاب المعروف الجبائی کا شاگرد تھا۔ اس نے اپنے استاد سے اختلاف کرتے ہوئے ایک نئے مکتبِ فکر کی بنیاد ڈالی جو اسی کے نام سے منسوب ہو کر اشعری کہلایا۔

اشاعرہ کے عقائد کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ قرآن مجید قدیم ہے۔

۲۔ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے۔ یعنی وہ صحیح اور (باقی صفحہ ۱۱۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

خیالات کی حامی تھی اور ظاہر ہے کہ مختلف اسلامی فرقوں کے مابین میل جول کے نتیجے میں کس قدر مؤثر ثابت ہوئی اور مختلف فرقے گوناگوں شعار رکھنے کے باوجود ایک روح میں متحد ہو گئے۔

بہت سے لوگ ولایت تکوینی کے ـــ ان معنوں میں کہ پیغمبر کا نفسِ مطہر یا ولی تکوین کے نظام میں تصرف کرسکتا ہے ـــ منکر ہو گئے اور اس قسم کی ولایت پر اعتقاد کو الحاد اور شرک کہنے لگے۔ حتیٰ کہ بارھویں صدی کے وسط میں یعنی آج سے دوسو سال سے کچھ مدت پیشتر وہابیوں کے فرقے کا بانی محمد بن عبدالوہاب حجاز میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مکمل یگانہ پرستی اور اسلامی عقیدۂ توحید کی تجدید کے نام سے ہر چیز کو بدعت، کفر اور شرک کا نام دے دیا۔ وہ اپنی کتابوں "کتاب التوحید" اور "کشف الشبہات" میں صالحین اور پاک لوگوں سے توسل اور ان کی تکوینی اور واقعی برتری اور ایسی ہی دوسری چیزوں پر اعتقاد کو نظامِ تکوین میں غیر اللہ کے تصرف کا عقیدہ گردانتے ہوئے شرک قرار دیتا ہے اور آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ سے استدلال کرتا ہے۔

فرید وجدی نے اپنے دائرۃ المعارف کی دسویں جلد میں مادہ "وھب" کے تحت اس کے کچھ خیالات بیان کیے ہیں اور اس کا پرزور دفاع کیا ہے۔

(صفحہ ۱۰۹ سے آگے) غلط اعمال کے انتخاب میں آزاد نہیں ہے۔ ان کے نزدیک انسان کے تمام اعمال پہلے سے مقدر کیے ہوتے ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات سے الگ ہیں۔

عقیدۂ جبر کی بنا پر اشعری چونکہ انسان کو فاعلِ مختار نہیں سمجھتے اس لیے وہ یزید اور دوسرے خلفاء کے برے اعمال کو جائز قرار دیتے ہیں۔

یہ روح پچھلے چند سالوں میں شیعی دنیا میں بھی سرایت کر گئی اور کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو نبی اور ولی اور محمد بن عبدالوہاب کی اصطلاح میں صالحین کے مقام کو دوسرے لوگوں کے مقام سے برتر نہیں سمجھتے اور ان کا خیال ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح ان کا علم بھی کچھ ذہنی امور کے جاننے تک محدود ہے اور انہوں نے باطن کے مرحلے میں قدم نہیں رکھا یا بنیادی طور پر کسی ایسی چیز کا ہونا محال ہے اور اس پر اعتقاد رکھنا توحید کے منافی ہے۔ یہ لوگ زیادہ سے زیادہ پیغمبر یا امام کو دوسرے سے زیادہ صاحبِ علم اور زیادہ دانا سمجھتے ہیں۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولایت تکوینی کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ ایک انسان آزادانہ طور پر خدا کے مقابلے میں کوئی چیز پیدا کرے اور کائنات کے نظام میں تصرف کرے اور اس کا ارادہ خدا کے ارادے سے جدا ہو۔

صورت یہ ہے کہ مذکورہ بالا عقیدے کے شرک ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ صرف یہی نہیں کہ نظامِ کائنات کے بارے میں ایسا اعتقاد رکھنا شرک ہے بلکہ اگر کوئی شخص کسی انسان کی معمولی سے معمولی جسمانی حرکت کو بھی آزادانہ سمجھے اور اس کے ارادے کو خدا کے ارادے سے الگ تصور کرے تو اس کا عقیدہ یقیناً شرک ہے کیونکہ وہ خدا کی مطلق فاعلیت کے مقابلے میں ایک دوسرے مستقل فاعل پر اعتقاد رکھتا ہے لیکن بحث کی بنیاد یہ ہے کہ جیسے ہم انسان یا دوسری موجودات کی عام حرکات کو خود ان سے نسبت دیتے ہیں اور فی الحقیقت انہیں فاعل سمجھتے ہیں اور یہ اعتقاد توحید کے منافی نہیں ہے اسی طرح اس چیز پر اعتقاد کہ ایک انسان حقیقی ارتقا اور روحانی قوت کے نتیجے میں ایک چیز پیدا کر سکتا ہے توحید کے منافی نہیں ہے اور یہ عمل انسان کے ہاتھ کو حرکت دینے یا بات کرنے سے کسی طرح متفاوت نہیں ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ عقیدہ رکھنا کہ انسان خود حرکت اور کلام پیدا کرتا ہے شرک نہ ہو لیکن اس چیز پر اعتقاد کہ ایک کامل انسان نے ایک موجود پیدا کیا ہے شرک ہو؟ کیا فعل کی بڑائی اس بات کا موجب بن جاتی ہے کہ انسان کا ارادہ اور قدرت خدا کے ارادے سے الگ ہو؟

جیسا کہ تمام موجودات اپنی عام حرکات اور افعال کے معاملے میں خدا کے ارادے اور قدرت کے ماتحت ہیں، اسی طرح کامل اور پاک لوگ بھی خدا کے ماتحت ہیں اور اس بارے میں ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

قرآن مجید اور اولیاء کی ولایت تکوینی

یوں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے نقطہ نگاہ کے مطابق انبیاء کی ولایتِ تصرف یعنی ولایت تکوینی کے حقیقی اور صحیح ہونے کے بارے میں کوئی شک نہیں ہے۔ تاہم جہاں تک غیر انبیاء کا تعلق ہے حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبأ کے قصے میں ارشاد ہوا ہے کہ:

(سلیمانؑ) نے کہا: "اے لوگو! تم میں سے کون ایسا ہے کہ قبل اس کے کہ وہ لوگ میرے سامنے فرمانبردار بن کر آئیں اس کا (ملکۂ سبأ کا) تخت میرے پاس لے آئے۔

جنوں میں سے ایک دانا جن نے کہا کہ قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں میں وہ تخت آپ کے پاس لے آؤں گا اور میں اس پر قدرت رکھتا ہوں اور ذمے دار (امین) ہوں۔

پھر اس شخص نے جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا کہا:
میں آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے وہ تخت آپ کے پاس
حاضر کیے دیتا ہوں (اور بس اتنے میں ہی وہ لے آیا)۔"

(سورۂ نمل - آیات ۳۸ تا ۴۰)

یہاں جنوں میں سے ایک طاقتور شخص کی اور ایک ایسے شخص کی ولایتِ تصرف ثابت ہوتی ہے جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا اور قوت اور طاقت کو ان سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو بے حد کم وقت میں ـــــ ایک سیکنڈ سے بھی کم مدت میں ـــــ اتنا فاصلہ طے کر سکتی ہے جسے آجکل کی سائنس اور صنعت کے برق رفتاری کے دور میں بھی طے کرنا ممکن نہیں۔

جہاں تک جن کا تعلق ہے قرآن مجید نے اس کی قدرت اور ولایت کے راز کی جانب اشارہ نہیں کیا لیکن دوسرے شخص کے بارے میں بتایا ہے کہ اس کی قدرت اور ولایت کا سبب یہ تھا کہ وہ کتاب کا کچھ علم رکھتا تھا۔

اس آیت میں جس "علمِ کتاب" کا ذکر ہے اس کے بارے میں مفسرین نے بہت سے امکانات بتائے ہیں لیکن اس سے مراد خواہ کچھ ہو اتنی بات مسلمہ ہے کہ یہ علم لفظی نہیں تھا بلکہ ایک قوت بخشنے والی اور قدرت پیدا کرنے والی حقیقت تھی۔

'کتاب کے کچھ علم' اور کتاب کے علم میں فرق ہے اور جب کتاب کا کچھ علم ولایتِ تصرف کا موجب بن سکتا ہے تو لازمی طور پر پوری کتاب کا علم زیادہ مؤثر اور زیادہ قوت بخشنے والا ہوگا۔

سورۂ رعد کی آخری آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ:

"کافر کہتے ہیں کہ تم پیغمبر نہیں ہو۔ تم ان سے کہہ دو کہ میرے اور
تمہارے درمیان (میری رسالت کی) گواہی کے لیے خدا اور وہ

شخص جس کے پاس آسمانی کتاب کا علم ہے کافی ہیں"۔

اکثر مفسرین اس کے قائل ہیں کہ اس شخص سے مراد امام علی ابن ابیطالبؑ ہیں۔

رکوع کی حالت میں زکات دینے کے متعلق آیت

جس آیت سے زیر بحث ولایت یعنی ولایت تصرف کا پتا چلتا ہے وہ سورۂ مائدہ کی ۵۵ ویں آیت ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ:

"تمہارے ولی تو بس خدا اور اس کا رسولؐ اور وہ مومنین ہیں جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں"۔

اس آیت پر دو لحاظ سے بحث کی جا سکتی ہے ایک یہ کہ مومنین (الّذین اٰمنوا) سے کون لوگ مراد ہیں۔ کیا اس سے عام مومنین مراد ہیں یا ایک مخصوص شخص مراد ہے اور دوسرے یہ کہ "ولی" سے کیا مراد ہے؟

پہلا نکتہ

اہلِ سنّت کے کئی مفسرین نے کہا ہے کہ چونکہ یہ آیت ان آیات کے بعد واقع ہوئی ہے جن میں یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ دوستی قائم کرنے سے (جسے ولایت نصرت کہا جاتا ہے) منع کیا گیا ہے اس لیے یہ آیت بھی خدا، پیغمبرؐ اور مومنین کے لیے ولایت نصرت کی توثیق کرتی ہے یعنی

خدا، پیغمبر اور مومنین تمہاری مدد کرتے ہیں اور مجموعی طور پر ان آیات کا مقصد ایک ہی ہے اور اس آیت سے جو کچھ مراد ہے اس کی جانب اشارہ سابقہ آیات سے ملتا ہے اور مجموعی طور پر ایک جگہ کچھ لوگوں سے دوستی قائم کرنے اور ان کی مدد کرنے سے منع کیا گیا ہے اور دوسری جگہ خدا، پیغمبرؐ اور مومنین سے دوستی اور ولایتِ نصرت کے بارے میں ہدایت کی گئی ہے۔

ان حضرات نے یہ کہا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ گو یہ امر مسلمہ ہے کہ سورۂ مائدہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسولِ اکرمؐ کی زندگی کے آخری سال میں نازل ہوئی ہے لیکن یہ بات بھی مسلم ہے کہ اس کی سب آیات ایک دفعہ ہی نازل نہیں ہوئیں کیونکہ اس سورے کی آیات کے درمیان ہم ایسی آیات بھی دیکھتے ہیں جو حجۃ الوداع سے پہلے نازل ہوئی ہیں اور خود ان کا مضمون اس بات کی تصدیق کرتا ہے مثلاً آیت وضو (چھٹی آیت) اور چور کی سزا کے بارے میں آیت (۳۸ ویں آیت)۔

پس اگر ایک آیت دوسری آیت کے بعد واقع ہو تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ان کا تعلق ایک ہی مضمون سے ہے اور اسی طرح دو آیتوں میں مناسبت اس بات کی دلیل نہیں کہ دونوں اکٹھی نازل ہوئی ہیں یا دونوں ایک مطلب سے متعرض ہیں۔

اور پھر سابق آیات میں جس چیز سے منع کیا گیا ہے اور جن کی ابتدا میں کہا گیا ہے کہ:

"اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا ولی نہ بناؤ۔ ان میں سے بعض، بعض دوسروں کے ولی ہیں اور تم میں سے جو کوئی

انہیں اپنا ولی بناتا ہے وہ انہیں میں سے ہے۔"

وہ ولایت نصرت نہیں ہے کیونکہ دو گروہوں کے درمیان مدد کا عہد ان میں سے کسی گروہ کو دوسرے گروہ کا حصّہ قرار نہیں دیتا اور یہ صحیح نہیں ہے کہ ولایت نصرت سے منع کیا جائے اور اس کی دلیل یہ دی جائے کہ ان میں سے بعض بعض دوسروں کے ولی ہیں۔ اس کے برعکس دوستی اور محبت کی ولایت دو گروہوں کے درمیان مکمل وابستگی کا موجب ہوتی ہے اور انہیں اعمال، اخلاق اور قومی اور روحانی خصوصیتوں کے بارے میں ایک دوسرے کے نزدیک کر دیتی ہے اور قدرتی طور پر جو دلیل اس آیت میں دی گئی ہے وہ اس صورت کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔

اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ ایک پیغمبر ان معنوں میں لوگوں کا ولی ہو کہ ان کی مدد کرے بلکہ یہ لوگ ہیں جنہیں چاہیے کہ پیغمبروں کی مدد کریں اور وہ جن خطرات سے دوچار ہوں انہیں دور کرنے کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیں۔ چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے:

"جس طرح مریم کے بیٹے عیسیٰ نے حواریوں سے کہا تھا کہ خدا کی طرف بلانے میں میرے مددگار کون ہیں تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ہم خدا کے انصار ہیں۔"

(سورۂ صف۔ آیت ۱۴)

اور پھر فرماتا ہے:

"اس پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو۔"

(سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۸۱)

دین کا تعلق دراصل "رسول" سے ہے کیونکہ وہی دین لاتا ہے اور

اس کی تبلیغ کرتا ہے۔ پس مومنوں کو چاہیے کہ اس کی مدد کریں۔ ایسا نہیں ہے کہ دین کے مالک تو مومن ہوں اور پیغمبر کے لیے ضروری ہو کہ وہ ان کی مدد کرے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زیر بحث آیت کا مقصد اور اس سے قبل کی آیات کا مقصد ایک نہیں ہے اور ضروری ہے کہ آیت زکات میں "ولی" سے مراد وہ ولایت ہو جو پیغمبر کی شان سے ہم آہنگ ہو اور وہ یا ولائے محبت ہے یا ولائے زعامت ہے اور یا ولائے تصرف ہے[1]

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا اس آیت میں "ولی" کے معنی دوست کے لیے جا سکتے ہیں؟

اول تو یہ کہنا چاہیے کہ بنیادی طور پر لفظ "ولی" دوست کے معنوں میں نہیں آیا اور دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت میں "ولیکم" میں شامل لفظ "کُم" کے ذریعے تمام مومنوں سے خطاب کیا گیا ہے۔

پھر اس کے معنی کیا ہوئے کہ کہا جائے کہ تم مسلمانوں اور مومنوں کے دوست وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں جبکہ پہلے سب کو ایک اکائی فرض کر کے ان سے خطاب کیا گیا ہے؟ بلکہ اگر یہ کہنا مراد ہوتا تو کہا جاتا کہ تم ایک دوسرے کے دوست ہو۔ پس "ولی" سے مراد دوست نہیں ہو سکتا۔

اور پھر "ولی" کے معنی خواہ کچھ بھی ہوں "الذین اٰمنوا" (جو ایمان لائے ہیں) سے مراد سبھی مومن نہیں ہو سکتے بلکہ اگر یہ مراد ہوتی تو اس کی تعبیر اسی طرح ہوتی جس طرح اس آیت کی ہے:

---

[1] تفسیر المیزان۔ علامہ محمد حسین طباطبائی۔ جلد ۶۔ صفحات ۱ - ۵

"بعض ایمان والے مرد اور عورتیں بعض دوسروں کے ولی ہیں"۔

(سورۂ توبہ۔ آیت ۷۱)

لہٰذا اس آیت میں 'الذین آمنوا' (ایمان لانے والوں) سے مراد بعض مومن ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بعض مومن کون ہیں؟

بعد کے جملوں میں ارشاد ہوا ہے کہ:

"جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکات دیتے ہیں"

اس سے ان 'بعض' کا پتا چلتا ہے اور تاریخ اسلام میں امیرالمومنین ع[1] کے علاوہ اور کسی ایسے شخص کا ذکر نہیں جس نے نماز پڑھتے ہوئے بحالتِ رکوع صدقہ دیا ہو۔

دوسرا نکتہ

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے یہاں "ولی" کا لفظ مددگار کے معنوں میں نہیں

---

[1] تفسیر روح المعانی، تفسیر در المنثور، تفسیر کشّاف، تفسیر کبیر، تفسیر ثعلبی، تفسیر بیضاوی، تفسیر خازنی، تفسیر نسفی، تفسیر محی الدین العربی، تفسیر طبری، تفسیر واحدی، تفسیر ابو البرکات اور تفسیر نیشاپوری۔ اس کے علاوہ دیکھیے:

الفصول المہمہ۔ ابن الصبّاغ مالکی، مطالب السئول۔ ابن طلحہ شافعی، التذکرہ۔ سبط ابن جوزی، الکفایۃ۔ الکنجی شافعی، مناقب۔ خوارزمی، فرائد۔ حموینی، المواقف۔ قاضی عزالدین عیجی، ریاض۔ طبری ذخائر۔ البدایۃ والنہایہ۔ ابن کثیر، جامع الجوامع۔ سیوطی، صواعق۔ ابن حجر، نور الابصار۔ شبلنجی۔

ہے اور دوست کے معنوں میں بھی نہیں ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ "ولی" کا لفظ یہاں بطور مفرد استعمال ہوا ہے۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ "خدا، پیغمبرؐ اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ تمہارے ولی ہیں" تاکہ ہر ایک کو الگ الگ ولی سمجھا جائے بلکہ فرمایا گیا ہے کہ خدا اور پیغمبرؐ اور ایمان لانے والے سب تمہارے لیے 'ایک' ولی ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ ولایت فقط 'ایک' ولایت ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ یہ ولایت جہاں تک خدا کا تعلق ہے اصلی اور حقیقی ہے اور جہاں تک پیغمبرؐ اور ایمان لانے والوں کا تعلق ہے وہ خدا کی متابعت میں ہے اور اس ذاتِ اقدس کی جانب سے تفویض کی گئی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبرؐ اور ایمان لانے والوں کی ولایت خدا کی ولایت کا ہی ایک پہلو ہے اور اس سے جدا یا مستقل کوئی چیز نہیں ہے۔ امام صادقؑ نے بھی اس مطلب کی جانب اشارہ کیا ہے اور فرماتے ہیں:

"گویا خدا نے ہمیں اپنے ساتھ ملا لیا ہے کیونکہ اس نے ہماری ولایت کو اپنی ولایت قرار دیا ہے اور فرمایا ہے: انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین آمنوا"[1]

اس کے علاوہ خصوصاً ولایت کے 'ایک' ہونے کی بنا پر اس آیت سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ ہر وہ ولایت جو خدا سے منسوب ہے وہ پیغمبرؐ اور 'ایمان لانے والوں' سے بھی منسوب ہے اور اگر وہ ولایت خدا سے منسوب ہوتی اور صرف اسی کی ہوتی تو وہ اس ولایت سے الگ ہوتی جو پیغمبرؐ اور ایمان لانے والوں سے منسوب ہے اور ضروری تھا کہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے لفظ "ولی"

---

[1] اصول کافی - جلد ۱ صفحہ ۱۴۶ - نیا ایڈیشن۔

کی تکرار کی جاتی اور قرآن مجید میں کئی مواقع پر غلط فہمی دور کرنے کے لیے الفاظ کی تکرار کی گئی ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا ہے:

"(اے رسول!) کہہ دیجیے کہ "کان" ہونا تمہارے لیے بہتر ہے۔ وہ خدا پر ایمان لاتے ہیں اور مومنین کی باتوں پر ایمان لاتے ہیں۔" (سورۂ توبہ۔ آیت ۶۱)

یہاں لفظ 'یؤمن' کی تکرار ہوئی ہے اور ایسی ہی اور کئی مثالیں ہیں اور چونکہ زیرِ بحث آیت میں لفظ "ولی" کی تکرار نہیں ہوئی اس لیے پتا چلتا ہے کہ اس کے جو معنی اسے خدا سے منسوب کرنے میں ہیں وہی معنی پیغمبرؐ اور ایمان لانے والوں سے منسوب کرتے میں ہیں اور دونوں صورتوں میں مراد 'ایک' ہے اور اس میں کوئی تفاوت نہیں۔

قرآن مجید میں خدا کی دو قسم کی ولایت بیان کی گئی ہے:

۱۔ تکوین میں ولایت جس کے مطابق وہ ہستی اور وجود کی دنیا کے نظام میں تصرف کرتا ہے اور جو چاہتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے اسے انجام دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

"خدا جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۵۳)

اور حضرت یوسف علیہ السلام کی مناجات کے سلسلے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

"اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا ولی ہے۔ تو مجھے دنیا سے مسلمان اٹھائے اور مجھے نیکوکاروں میں شامل فرما۔" (سورۂ یوسف۔ آیت ۱۰۱)

اس آیت سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ "ولی" سے مراد 'تکوین' اور 'خلقت' میں

ولی ہے۔

پھر فرماتا ہے:

"کیا تم خدا کے سوا دوسروں کو اپنا ولی بناتے ہو؟ ولی تو بس خدا ہی ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

(سورۂ شوریٰ۔ آیت ۹)

یعنی کیا تم خدا کے علاوہ کسی دوسرے کو ولی اور خالق سمجھتے ہو حالانکہ نظامِ تکوین خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس آیت سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ "ولی" سے مراد ولیٔ تکوین ہے۔

۲۔ خدا کی دوسری ولایت کا تعلق قانون سازی سے اور ان چیزوں سے ہے جو انسانی معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے کہ:

"خدا ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے ہیں وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔"

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۵۶)

اور پھر فرماتا ہے:

"خدا مومنوں کا ولی ہے۔"

(سورۂ آل عمران۔ آیت ۶۸)

قرآن مجید میں ولایت کی یہ دو اقسام خدا کے لیے ثابت ہیں اور اگر ان میں سے ایک قسم کی ولایت پیغمبر اور ایمان لانے والوں کے لیے محال ہوتی اور ان کے لیے مناسب نہ ہوتی تو زیرِ بحث آیت میں یقیناً لفظ ولی کی تکرار ہوتی اور چونکہ اس لفظ کی تکرار نہیں کی گئی اس لیے پتا چلتا ہے کہ ولایت کی ان دو اقسام میں سے کوئی بھی نہ صرف یہ کہ ان کے لیے محال نہیں بلکہ یہ امر ثابت ہے کہ وہ

بھی ولایت کی ان دونوں اقسام کے حامل ہیں۔[1]

آخر میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر مزید بحث کی گنجائش ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ ہوسکتا ہے ان کا سمجھنا بعض لوگوں کے لیے مشکل ہو لہٰذا ان کے متعلق مزید توضیح کی ضرورت ہے۔ فی الحال ہم اس موضوع پر مزید کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ اگر تائید خداوندی شاملِ حال رہی تو اس سلسلے میں ایک الگ رسالہ تحریر کریں گے۔

□□□□□□□□□□□□□□

---

[1] تفسیر المیزان۔ جلد ۶۔ صفحات ۱۰-۱۲۔

امام

کی باطنی و معنوی ہدایت

اسلام اور عدالت

رسولِ اکرمؐ کی زندگی اور آپ کا طرزِ عمل اسلام کے بنیادی لائحہ کار کا صحیح نمونہ ہے۔ آپ اسلامی معاشرے کے سیاسی رہنما اور فرمانروا بھی تھے اور آپ کو خدا کی جانب سے وحی کے ذریعے اسلامی احکام اور قوانین بھی موصول ہوتے تھے جنہیں آپ اسلامی دائرۂ حکومت میں نافذ فرماتے تھے۔ آپ کا کردار مجسم قانون، آپ کے طور طریقے سراسر اخلاق اور آپ کے ارشادات عاقلانہ اور ٹھوس رہنمائی اور ہدایت کے حامل تھے۔ آپ وعظ و نصیحت پر ہی اکتفا نہیں فرماتے تھے بلکہ آپ کا مطمحِ نظر صحیح عدالت پر مبنی ایک مثالی معاشرے کی تشکیل تھا۔

چونکہ اسلام کو معاشرے کی بہبود کے حصول کے سلسلے میں دنیاوی لحاظ سے بھی جزا و سزا کی پشت پناہی حاصل ہے لہٰذا ایسا نہیں ہے کہ جو لوگ اپنے جرائم کے ذریعے معاشرے کے مفادات کو نقصان پہنچائیں یہ دین ان کی سزا کا معاملہ فقط آخرت پر چھوڑ دیتا ہے بلکہ یہ اس دنیا میں ہی انہیں مقرر کردہ سزا دیتا

ہے۔ پس آنحضرتؐ کا کارِ منصبی لوگوں پر حکومت کرنا اور ان کی رہنمائی کرنا تھا۔

تاہم اسلام بلاشبہ دنیا کے دوسرے حکومتی نظاموں سے اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ وہ ہر انسان کے وجود کے دوسرے پہلو پر بھی مسلسل نظر رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ اکثر اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ روحانی اور انسانی فضائل حاصل کرنے کی تاکید بھی کرتا ہے۔

اس زمانے میں جس چیز کو انسانی تمدّن میں بہت حد تک بھلا دیا گیا ہے اور دن بہ دن اس کے ناپاک نتائج دیکھنے میں آرہے ہیں وہ یہی مسئلہ ہے یعنی "انسانیت اور روحانیت کو فراموش کر دینا"۔ تاہم اسلام اس اہم معاملے کی جانب خاص توجّہ دیتا ہے اور اس کے پیشواؤں نے اپنے نظریات کی بنیاد ہمیشہ انسانوں کی روحانی تربیت پر رکھی ہے۔

بیشتر لوگ اپنے عظیم الشان انسانی جوہر کی حقیقت سے غافل ہیں کیونکہ یہ اس قدر لطیف اور دقیق ہے کہ فقط روشن دل اشخاص ہی اس کا ادراک کر سکتے ہیں۔ پس عام افراد کے نقطۂ نظر کے مطابق ہر انسان کے وجود کی یہ خوشگوار سرزمین لوگوں کے خیالات، مقاصد اور نگاہ سے دور ہے اور وہ اس کی جانب توجہ دینے سے عاجز ہیں۔ چہ جائیکہ وہ اس میدان میں رہنما بن سکیں۔ جو انسان صدیاں گزر جانے کے باوجود ابھی تک اپنے بدن کے آدھے طبیعی افعال اور ان کے ردعمل سے واقف نہیں ہو سکا اس سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اس کے مابعد الطبیعیاتی پہلو کو سمجھے اور اس دور افتادہ مقام تک پہنچنے کے لیے پروگرام اور منصوبہ پیش کرے؟

لہٰذا اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس میدان میں رہنما وہی شخص ہو سکتا ہے جس کے وجود کا جوہر مابعد الطبیعیاتی دنیا سے تعلق رکھتا ہو اور وہ اس دنیا کا

جاننے والا اور اس وادی کے تمام مخفی اور طویل راستوں پر چلنے والا ہو کیونکہ کہا گیا ہے کہ جب تک تم خود راستے پر نہ چلو دوسروں کی رہنمائی کیسے کر سکتے ہو۔

درحقیقت کیا یہ مناسب ہے کہ ہم انسان کے روحانی مقدر سے ناامید ہو جائیں۔ ہر انسان کی مخصوص روحانی استعداد اور اس کے ارفع جوہر کو نظرانداز کردیں۔ اسے حیوانوں کے برابر سمجھیں اور کھانے پینے، سونے، خشمگیں ہونے اور شہوت پرستی کے لیے چھوڑ دیں تاکہ وہ کیڑے مکوڑوں کی طرح اپنی حیوانی ضروریات کی تکمیل میں ہی الجھا رہے؟ نہیں۔ یہ باتیں ہرگز انسان کے بلند مقام کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

اپنی روحانی اور ملکوتی ضرورتوں اور اس مخصوص استعداد کی بنا پر جو خدا نے اس کی فطرت میں ودیعت کی ہے انسان تخلیق کا شاہکار اور کائنات کا سورج ہے۔ اسے چاہیے کہ چمکتے ہوئے سورج کی طرح ان بلندیوں پر پہنچے جو دسترس سے دور ہوں اور سورج کی طرح تمام آفاق کو حرارت پہنچائے کیونکہ یہ برگزیدہ مخلوق کائنات میں سرگرداں نہیں ہے۔ یہ ایک ذرہ ہے لیکن الوہیت کے بلند سورج کی شعاعیں اس پر پڑی ہیں اور خدا نے اپنی تمام مخلوق میں سے اس پر زیادہ مہربانی کی نگاہ ڈالی ہے۔

انسان پر خدا کی اس مہربانی کے آثار ہمیں اس کی تاریخ کے دوران میں پیغمبروں کی بعثت کی بدولت نظر آتے ہیں۔ اسی عنایت اور مہربانی کی بنا پر خدا نے پیغمبروں کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں کی رہنمائی کریں اور ان کی بلند روح کو بے آرامی اور آشفتگی سے نجات دلائیں اور عظیم رتبے پر پہنچائیں۔

قرآن مجید نے بے شمار آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً وہ آیت جس میں حضرت ابراہیم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ:

"اے پروردگار! میری اولاد کے لیے انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیج جو انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے۔ آسمانی کتاب اور عقل کی باتیں سکھلائے اور پاکیزہ کر دے۔ بے شک تو ہی غالب اور صاحب تدبیر ہے" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۹)

اسی آیت سے اس بات کا واضح طور سے پتا چلتا ہے کہ دانش، حکمت اور رہنمائی کے علاوہ پاکیزگی اور تزکیۂ نفس کو (جو دوسرے لفظوں میں روحانی تربیت ہے) انبیائے کرام کی دعوت کے ارکان میں شمار کیا گیا ہے۔

رسولِ اکرمؐ کے مکتب میں لوگوں نے یہ خاص تربیت حاصل کی اور حیرت انگیز اور خیرہ کن انداز میں ترقی کی۔ سلمان، ابوذر، مقداد، عمار، میثم اور اویس قرنی رضوان اللہ علیہم کا تعلق اسی بلند مرتبہ گروہ سے تھا۔ ان کا وجود خوبی، پاکیزگی اور اچھائی کا سرچشمہ تھا۔ وہ تمام نجاستوں سے پاک ہو گئے تھے۔ وہ خدا کے علاوہ نہ کسی کی خواہش رکھتے تھے اور نہ ہی کسی کو دیکھتے تھے۔ ان کے پورے وجود اور ان کی جان، دل، روح اور بدن پر فقط خدا کی حکومت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک ترقی یافتہ انسان کا نمونہ تھا اور انہوں نے اپنے وقت کے انسانوں اور معاشرے کی سرفرازی کے لیے عظیم خدمات انجام دیں۔

پس اخلاق اور روح کی اصلاح محض رسمی اور اضافی موضوع نہیں ہے تاکہ ہم اس سے لاتعلق رہیں حتیٰ کہ زندگی کے تمام مسائل سے فارغ ہو جائیں، اور ہمارا شوق اور زندگی اس بات کا موقع اور فرصت دیں تو اس موضوع کی جانب بھی توجہ دیں۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ اخلاق زندگی کی تعمیر کرتا ہے اور اس کا ایک حصہ ہے اور بلاشبہ بہت زیادہ اہم ہے۔ یعنی عقل

اور ہوش اس بات کی گواہی دیتے ہیں بلند پایہ اخلاقی صفات اور روح کی پاکیزگی اس قدر عظیم اور عمیق چیزیں ہیں کہ انسان ان کی پناہ میں صورت اور نقش سے آگے بڑھ جاتا ہے اور روحانی زندگی اور اپنی گرانبہا انسانی حقیقت تک جا پہنچتا ہے حتیٰ کہ وہ "وہ کچھ دیکھتا ہے جو دیکھا نہیں جا سکتا"۔ [1]

روحانی زندگی کی جانب قرآنی اشارے

"مرد ہو یا عورت، جو شخص نیک کام کرے اور ایماندار بھی ہو ہم اسے پاک اور پاکیزہ زندگی عطا کریں گے"۔ [2]

"جب خدا اور پیغمبر تمہیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمہاری روحانی زندگی کا باعث ہو تو تم ان کا حکم مانو کیونکہ تم زندہ کیے جاؤ گے"۔ [3]

ظاہر ہے کہ جس زندگی کا مندرجہ بالا آیات میں ذکر کیا گیا ہے وہ ظاہری طور پر زندہ ہونے سے مختلف ہے۔ وہ روحانی زندگی اور انسان کے صحیح طور پر زندہ ہونے کے علاوہ کچھ نہیں اور ایسی زندگی کردار سازی اور تزکیۂ نفس کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہے۔

روحانی زندگی کس طرح وجود میں آتی ہے

دوسرے مظاہر کی طرح روحانی زندگی کی پیدائش کے لیے بھی کچھ

---

[1] یہ معمولی تغیر کے ساتھ ہاتف اصفہانی کے ایک مصرعے کا ترجمہ ہے۔

[2] سورۂ نحل (آیت ۹۷) [3] سورۂ انفال (آیت ۲۴)۔

لازمی شرائط ہیں:

روحانی زندگی انسان کے طرزِ عمل اور کردار کا نتیجہ ہے۔ بلاشبہ یہ وہ طرزِ عمل اور کردار ہے جو صحیح تعلیم سے جنم لیتا ہے اور آسمانی استادوں سے سیکھا جاتا ہے۔

خداوند تعالےٰ کے اوامر و نواہی جنہیں اصطلاحاً "تشریع" کہا جاتا ہے کائنات اور عالم ہستی یعنی "تکوین" سے مکمل رابطہ اور وابستگی رکھتے ہیں۔ چونکہ ہماری عقل بہت ہی محدود ہے اور ہم کائنات کے حقائق اور اہم واقعات کی اچھائی اور برائی کو نہیں سمجھ پاتے لہٰذا ہم اس طرزِ عمل سے بے خبر ہیں جو ہماری روحانی زندگی کی تعمیر کرتا ہے لیکن امام ان حقائق اور عظیم الشان مصلحتوں کو ایک صاحب علم اور شفیق استاد کی طرح بنی نوع انسان کے لیے پوری وضاحت سے بیان کرتے ہیں تاکہ ہم اس خوش بختی سے ہمکنار ہوں اور روحانی زندگی حاصل کریں۔

لہٰذا دین ہمارے عام ادراک سے بالاتر حقائق اور معارف کا مجموعہ ہے جنہیں خدا نے اپنے پیغمبر اور ان کے پاک اور معصوم جانشینوں کے ذریعے بیان فرمایا ہے تاکہ وہ ہمارے اندر روحانی زندگی کو وجود میں لائیں جو ہماری دائمی خوش بختی کی ضمانت بن جائیں۔ اب اگر ہم حکم بجا لائیں تو نجات پائیں گے ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک بچہ تربیت پاتا ہے اور استاد سے فقط کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں احکام سنتا ہے اور انہیں بے چون و چرا بجالاتا ہے۔ اگرچہ وہ ان احکام کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پاتا اور اسے یہ علم نہیں ہوتا کہ ان کی بجا آوری میں کیا فائدہ ہے لیکن جب وہ اپنی تربیت کے دن گزار لے گا

تو اس تربیت کی بدولت جو اچھے اخلاق اور پسندیدہ طور طریقے اس کے اندر وجود میں آئیں گے ان کے ذریعے اس کی زندگی خوشگوار ہو جائے گی لیکن اگر وہ استاد کے احکام سے سرتابی کرے گا تو بعد میں اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس نے کتنا نقصان اٹھایا ہے۔

روحانی زندگی کے حصول اور ترقی کے لیے یقیناً ایک رہنما کی ضرورت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ رہنمائی کس کا حصّہ ہے۔ کیا یہ کام ایک عام آدمی انجام دے سکتا ہے یا رہنما کوئی ایسا شخص ہو جس کے الفاظ یقینی اور پائیدار ہوں وہ اپنے طرزِ عمل میں غلطیوں سے محفوظ اور اصطلاحاً "معصوم" ہو اور بذاتِ خود روحانی زندگی کی بلند چوٹی پر کھڑا ہو کیونکہ خدا جب تک کسی شخص کو مکمل طور پر ہدایت سے بہرہ ور نہ کر دے اسے دوسروں کی ہدایت کا کام سپرد نہیں کرتا۔ [1] بالخصوص اس لیے کہ بنیادی طور پر امامت کے معنی عام ہدایت کے نہیں ہیں کیونکہ ایسی ہدایت ہر مسلمان کا فریضہ ہے اور یہ امام سے مخصوص نہیں ہے۔

اس ہدایت سے مراد "امر کی جانب ہدایت" ہے اور جب تک وہ (یعنی ائمہ) روحانی زندگی حاصل نہ کر لیں اور کائنات کے سربستہ راز ان پر منکشف نہ ہو جائیں وہ اس قسم کی ہدایت کی ذمہ داری نہیں سنبھال سکتے۔

---

[1] "جو شخص دین کی راہ دکھاتا ہے کیا وہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کے حکم کی پیروی کی جائے یا وہ شخص جو خود ہی جب تک دوسرا اسے راہ نہ دکھائے راہ نہیں دیکھ سکتا؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ تم کیسا حکم لگاتے ہو؟"
(سورۂ یونس ۔ آیت ۳۵)

"امامت" اور "ہدایت" کے سلسلے میں قرآنی آیات پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ جہاں کہیں "امامت" کا مفہوم بیان کیا گیا ہے وہاں "امر کی جانب ہدایت" کے مسئلے کی تفسیر اور وضاحت بھی کی گئی ہے۔

"امر کی جانب ہدایت" کیا ہے؟

ظاہری احکام اور ہدایت سکھلانے کے ساتھ ساتھ امام باطنی ولایت اور ہدایت کا حامل بھی ہوتا ہے یعنی جو لوگ استعداد اور قابلیت رکھتے ہوں امام ان کا ہاتھ باطنی طور پر پکڑتا ہے اور ان کی رہنمائی کمال کی جانب کرتا ہے۔ چونکہ یہ ہدایت روحانی فیض اور باطنی مقامات کی بنیاد پر دی جاتی ہے اس لیے اسے "امر کی جانب ہدایت" کا نام دیا گیا ہے۔ باطنی ہدایت وہ بلند مقام ہے جس پر بڑے بڑے پیغمبر پیغمبری کے رتبے پر فائز ہونے کے بعد پہنچے ہیں۔ مثلاً خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو پیغمبری عطا کرنے کے بعد امامت اور باطنی ہدایت کے مقام پر پہنچایا اور فرمایا:

"میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔"

(سورۂ بقرہ - آیت ۱۲۴)

جب امام ولایت اور "امر کی جانب ہدایت" کے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ ایسے کام کر سکتا ہے جو عام لوگوں کو حیرت انگیز اور ناممکن معلوم ہوتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن مجید نے شہادت دی ہے حضرت سلیمانؑ کا ایک وزیر آصف بن برخیا ملکہ سبا کے حضرت سلیمانؑ کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی آنکھ جھپکتے میں اس کا تخت لے آیا کیونکہ وہ مابعد الطبیعیاتی دنیا پر مسلط

تھا اور اس نے اس دنیا کے کچھ پوشیدہ حقائق کا علم حاصل کر لیا تھا۔

ہمارے معصوم پیشواؤں اور ائمہ علیہم السلام کا مرتبہ آصف سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ معتبر تواریخ اور صحیح روایات ـــــ جن میں ہمارے عالی قدر اماموں کی روحانی ہدایت اور باطنی ولایت کے سلسلے میں بہت سی داستانیں بیان کی گئی ہیں ــــ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں۔

بہرحال امام چونکہ خود روحانی زندگی کے بلند رتبے پر فائز ہوتا ہے اس لیے وہ ایک ایسی ہدایت اور روحانی جذبے کا حامل ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ شائستہ لوگوں کے دلوں پر اثر ڈالتا ہے اور انہیں اپنے زیرِ اثر لا کر ان کی رہنمائی کمال کی جانب کرتا ہے۔ اس بارے میں ہمیں اماموں کے شاگردوں کے اس گروہ کے حالاتِ زندگی سے پتا چلتا ہے جن کے گرانبہا وجود پر تاریخ فخر کرتی ہے۔

ذیل میں ان بزرگواروں کی چند مثالیں درج ہیں:

۱۔ دمشق کا ایک شخص

علی بن خالد جو نویں امام حضرت جواد علیہ السلام کے زمانے میں زندگی بسر کر رہا تھا "زیدی" تھا یعنی چوتھے امام حضرت زین العابدین علیہ السلام کے بعد آنے والے اماموں کو نہیں مانتا تھا۔

اس کا کہنا ہے کہ میں شہر سامرا میں تھا جب کہ میں نے سنا کہ ایک ایسے شخص کو جو پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے دمشق سے پکڑ کر لایا گیا ہے، اور قید خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ چنانچہ میں اس سے ملنے چلا گیا۔

میں نے اس سے پوچھا: "تمہارا کیا حال ہے اور تمہارا قصّہ کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا: "میں ایک رات شام میں اس مقام پر جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کا سر مبارک بلند کیا گیا تھا عبادت میں مشغول تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک بزرگوار میرے سامنے کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ اٹھ!... میں غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دور تک ان کے ساتھ چلا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں مسجدِ کوفہ میں ہوں۔ ان بزرگوار نے دریافت کیا: کیا تم اس مسجد کو پہچانتے ہو؟

میں نے جواب دیا: جی ہاں یہ مسجد کوفہ ہے۔ انہوں نے نماز پڑھی اور میں نے بھی ان کے ساتھ ہی نماز پڑھی۔ اس کے بعد ہم دونوں دوبارہ روانہ ہو گئے۔ ابھی ہم نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو مسجد النبی میں پایا۔ ان بزرگوار نے رسولِ اکرمؐ پر درود بھیجا اور ہم دونوں نے وہاں نماز بھی پڑھی۔

پھر ہم وہاں سے نکلے اور راستہ چلنے لگے۔ ایک لحظہ کے بعد میں نے دیکھا کہ میں مکہ میں ہوں۔ وہاں ہم دونوں خانۂ خدا کا طواف کر کے باہر نکلے اور زیادہ دور تک نہیں چلے تھے کہ میں نے دیکھا کہ میں دمشق میں اپنے پہلے مقام پر پہنچ گیا ہوں۔ وہ بزرگوار اب میری نظروں سے غائب ہو گئے۔ یوں سمجھیے کہ ایک معطر ہوا کا جھونکا تھا جو میرے چہرے کو چھو کر گزر گیا۔

اس واقعہ کو ایک سال گزر گیا۔ سال بھر بعد میری ملاقات دوبارہ انہی بزرگوار سے ہو گئی اور میں انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ انہوں نے ایک بار پھر مجھے مقدس مقامات کے سفر کی دعوت دی۔ چنانچہ ہم نے مل کر دوبارہ ان پُرنور مقامات کی زیارت کی۔ تاہم جب وہ بزرگوار مجھ سے جدا ہونے لگے تو میں نے انہیں کہا:

مَیں آپ کو اس ہستی کی قسم دیتا ہوں جس نے آپ کو اتنی قوت بخشی ہے کہ آپ اپنا تعارف مجھ سے کرا دیں۔

انہوں نے فرمایا: میں محمد بن علی بن موسیٰ بن جعفر ہوں۔

جن جن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی ہیں نے یہ واقعہ ان سے بیان کیا۔ حتیٰ کہ یہ خبر محمد بن عبد الملک زیات تک پہنچی۔ اس نے میری گرفتاری کا حکم دیا اور مجھ پر یہ الزام لگایا کہ میں نے پیغمبر ہونے کا دعوےٰ کیا ہے اور اب جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں مَیں اس قید خانے میں ہوں۔

مَیں نے اس سے کہا: کیا تم چاہتے ہو کہ مَیں تمہارے حالات محمد بن عبد الملک کو لکھ بھیجوں؟

اس نے جواب دیا: لکھ بھیجیے۔"

میں نے محمد بن عبد الملک کو خط لکھا لیکن اس نے جواب میں یہ لکھ بھیجا:

"اس سے کہہ دو کہ جو شخص اسے ایک رات میں شام سے کوفہ اور پھر مدینہ اور مکہ اور پھر دوبارہ دمشق لے گیا، اسی سے کہے کہ وہ اسے اس قید خانے سے رہائی دلائے۔"

مجھے یہ جواب پڑھ کر دکھ ہوا۔ دوسرے دن میں صبح کے وقت قید خانے گیا تاکہ اسے خط کے جواب کے بارے میں بتا دوں۔ تاہم مَیں نے دیکھا کہ بہت سے سپاہی اور بے شمار لوگ قید خانے کے علاقے میں گھوم رہے ہیں۔ مَیں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ ماجرا کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ جس قیدی نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا وہ قید خانے سے بھاگ نکلا ہے اور کچھ پتا نہیں چلتا کہ آیا وہ اڑ کر آسمان پر جا پہنچا یا اسے زمین نگل گئی۔

علی بن خالد کہتا ہے: اس واقعہ کے پیشِ نظر میں نے اپنا "زیدی"

عقیدہ ترک کر دیا اور نویں امام حضرت جوادؑ کے شیعوں میں شامل ہو گیا۔[1]

۲۔ میثم تمار

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے میثم کو خریدا اور آزاد کر دیا۔ دریں اثنا آپ نے اس سے دریافت کیا کہ تمہارا نام کیا ہے؟

اس نے جواب دیا: سالم۔

امام علیؑ نے فرمایا: لیکن میں نے تو رسولِ اکرمؐ سے سنا ہے کہ تمہارا اصلی نام میثم ہے۔

میثم نے جواب دیا: آنحضرتؐ نے بجا فرمایا ہے اور آپ بھی درست فرماتے ہیں۔ میرا اصلی نام میثم ہی ہے۔

امام علیؑ نے فرمایا: پس تم وہی نام اختیار کرو جس کے بارے میں رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے اور دوسرا نام ترک کر دو۔

یوں امام علیؑ نے ایک غلام خریدا اور اسے آزاد کر دیا لیکن اس کی گردن میں مہربانی کی ایسی ڈوری ڈالی جس میں وہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک بندھا رہا حتیٰ کہ موت بھی اس ڈوری کو اس کی گردن سے الگ نہ کر سکی۔

جناب میثم ایک شریف النفس انسان تھے جو حیرت انگیز استعداد کے مالک تھے۔ انہوں نے رفتہ رفتہ امام علیؑ کے مکتب میں بے پناہ

---

[1] ۔ بحار الانوار (جلد ۵۰ ۔ صفحہ ۳۸) میں یہ واقعہ اصول کافی جیسی معتبر کتابوں سے نقل کیا گیا ہے۔

عزّت حاصل کرلی اور ان کا شمار آپکے خاص دوستوں میں ہونے لگا۔

انہیں دقیق مسائل اور حقیقتوں کا علم حاصل ہوگیا۔ انہیں امام سے ایسا ہی عشق تھا جیسا کہ کملائے ہوئے پودوں کو بارش سے ہوتا ہے۔ وہ انہیں سے فیضان حاصل کرتے تھے، انہیں کی خدمت میں رہتے تھے اور انہیں کی بدولت اپنے دل کی روشنی اور روح کی خوشی میں اضافہ کرتے تھے اور یہ ایک ایسی لذّت تھی جس سے وہ دنیا جہان کی دولت کے عوض بھی دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے۔

ایک دن امام علیؑ نے ان سے فرمایا: ہمارے بعد تمہیں سولی پر لٹکا دیا جائے گا اور تیسرے دن تمہاری ناک اور منہ کے خون سے تمہاری ڈاڑھی رنگین ہو جائے گی۔ تمہیں عمرو بن حریث کے گھر کے پاس نو دوسرے افراد کے ساتھ سولی پر لٹکا دیا جائے گا اور تم سب شہید ہو جاؤ گے۔ تمہاری سولی کا تختہ سب سے چھوٹا ہوگا۔ چلو چلیں تاکہ ہم تمہیں کھجور کا وہ درخت دکھائیں جو بالآخر تمہاری سولی کا تختہ بنے گا۔

امام علیہ السلام نے اس دن وہ درخت میثم کو دکھایا۔ پھر کئی سال گزر گئے۔ امام علیؑ شہید ہو گئے۔ بنی امیہ نے لوگوں پر غلبہ پالیا۔

جناب میثم اکثر اس درخت کے پاس جا کر نماز پڑھتے اور اس سے یوں ہمکلام ہوتے: اے درخت! خدا تجھے برکت دے۔ میں تیرے لیے پیدا کیا گیا ہوں اور تو میرے لیے پھل پھول رہا ہے۔

جناب میثم اپنی شہادت کے سال میں خانۂ خدا کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حضرت ام سلمہ سے بھی ملاقات کی۔ حضرت ام سلمہ نے انہیں کہا: میں اکثر رسولِ اکرمؐ کو آپ کا نام لیتے سنتی تھی۔ وہ علیؑ سے آپ کی سفارش

کیا کرتے تھے۔

جناب میثم نے ان سے امام حسینؑ کے بارے میں دریافت کیا اور جب انہوں نے بتایا کہ وہ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں تو ان سے کہا: انہیں میرا سلام پہنچا دیجیے گا اور کہیے گا کہ اب زیادہ وقت نہیں لگے گا جب میں اور آپ دوسری دنیا میں اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے۔

حضرت ام سلمہ نے عطر منگوا بھیجا تا کہ جناب میثم اپنی ڈاڑھی کو خوشبو لگائیں۔ پھر انہیں کہا: "وہ وقت جلد آنے والا ہے جب (رسول اکرمؐ اور ان کے اہلِ بیت کی محبت میں) آپ کی ڈاڑھی خون سے رنگین ہو جائے گی۔"

جناب میثم کوفہ پہنچے۔ ابن زیاد کے اہلکاروں نے انہیں گرفتار کر لیا اور اس کے پاس لے گئے۔ پھر ان کے درمیان یہ گفتگو ہوئی:

ابنِ زیاد: تمہارا خدا کہاں ہے؟

جناب میثم: ظالموں کی گھات میں ہے اور تم ان میں سے ایک ہو۔

ابنِ زیاد: تمہارے مولا نے میرے اور تمہارے متعلق کیا کہا ہے؟

جناب میثم: انہوں نے فرمایا ہے کہ تم مجھے نو دوسرے افراد کے پہلو بہ پہلو سولی پر چڑھا دو گے اور میری سولی کا تختہ سب سے چھوٹا ہو گا۔

ابنِ زیاد: میں چاہتا ہوں کہ تمہارے مولا نے جو کچھ کہا ہے اُس کے خلاف کروں اور تمہیں کسی اور طریقے سے قتل کروں۔

جناب میثم: تم یوں کیسے کر سکتے ہو۔ انہوں نے یہ اطلاع رسولِ اکرمؐ کی طرف سے اور آنحضرتؐ نے خدا کی طرف سے دی ہے۔ کیا تم خدا کی مخالفت کر سکتے ہو؟ میں اپنی شہادت کی جگہ سے بھی واقف ہوں اور

پہلا مسلمان ہوں جس کے منہ میں لگام دی جائے گی۔

عبیداللہ بن زیاد کو بے حد طیش آیا اور اس نے حکم دیا کہ فی الحال انہیں قید خانے میں رکھا جائے۔

اسی قید خانے میں جناب میثم کی ملاقات مختار ثقفی سے ہوئی۔ انہوں نے اسے آزادی کی خوشخبری دی اور کہا کہ تم حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے قتل کا انتقام لینے کی خاطر ابنِ زیاد کو موت کے گھاٹ اتار دوگے اور ایسا ہی ہوا۔

بالآخر انہیں قربان گاہ میں لے جایا گیا اور اسی درخت کی لکڑی پر سُولی پر لٹکا دیا گیا جسے وہ پہلے سے پہچانتے تھے۔ لوگ ان کے گرد جمع ہوگئے سولی پر لٹکے ہوئے انہیں امام علی علیہ السلام کے فضائل بیان کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ انہوں نے زبان کھولی۔ لوگوں کو حقائق سے آگاہ کیا اور ان کے دل مسخر کر لیے۔ حکومت کے کارندوں نے ابن زیاد کو اطلاع دی کہ جناب میثم تمہیں ذلیل کر رہے ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ ان کے منہ میں لگام ڈال دی جائے تاکہ وہ بول نہ سکیں۔

اور تیسرے دن جیسا کہ امام علیؑ نے خبر دی تھی، ان پر ایک حربہ پھینکا گیا۔ اس پر انھوں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند کیا۔ اسی دن کے آخری حصے میں ان کے منہ اور ناک سے خون جاری ہوگیا اور ان کی ڈاڑھی خون سے رنگین ہوگئی۔ ان پر اللہ کی رحمت ہو۔[1]

---

[1] ارشاد مفید (صفحات ۱۵۲ تا ۱۵۴)

اویس قرنی

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: ہمیں یمن کی طرف سے بہشت کی خوشبو آتی ہے۔

جب "ذی قار" کے علاقے کے لوگ امام علی علیہ السلام کی بیعت کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا: کوفہ کی جانب سے نہ کم نہ زیادہ بلکہ پورے ایک ہزار جنگجو سپاہی آئیں گے اور ہمارے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔

جب وہ اشخاص آ گئے تو ابن عباس نے انہیں گنا اور پتا چلا کہ وہ ۹۹۹ ہیں۔ انہیں حیرت ہوئی کہ ایک شخص کم کیوں ہے۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک اور شخص آ پہنچا۔ اس نے اونی لباس پہن رکھا تھا اور تلوار، سپر اور دوسرے جنگی لوازمات سے لیس تھا۔ وہ حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: میں اپنی زندگی کے آخری لمحات اور جان قربان کرنے کی حد تک آپ سے بیعت کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت علیؑ نے فرمایا: تمہارا نام کیا ہے؟

اس نے جواب دیا: اویس۔

آپ نے پوچھا: کیا تم اویس قرنی ہو؟

جناب اویس نے جواب دیا: جی ہاں۔

اس پر امام علی علیہ السلام نے فرمایا: اللہ اکبر! میرے محبوب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے مجھے خبر دی تھی کہ میری ملاقات انکے ایک ایسے پیرو سے ہو گی جس کا نام اویس قرنی ہو گا۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے گروہ سے ہے۔ اسے شہادت نصیب ہو گی اور وہ بے شمار

لوگوں کی شفاعت کرے گا۔

حرف بہ حرف یہی کچھ ہوا۔ جناب اویس قرنی امام علی علیہ السلام کے ہمرکاب شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے۔ [1]

روحانی لحاظ سے جناب اویس ایک بڑا بلند مقام رکھتے ہیں۔ انہیں عبادت میں بے حد لذّت ملتی تھی۔ چنانچہ وہ آرزو کیا کرتے تھے کہ کاش وہ ازل سے ابد تک اللہ تعالیٰ کو سجدے کرتے رہتے۔

جناب اویس اپنی والدہ کے اخراجات کے کفیل تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنی والدہ سے اجازت مانگی کہ وہ یمن سے مدینہ جاکر رسولِ اکرمؐ کی زیارت کرآئیں۔ ان کی والدہ نے یہ اجازت اس شرط پر دی کہ یہ زیارت آدھے دن سے زیادہ طول نہیں کھینچے گی۔

جب اویس مدینہ پہنچے تو اتفاق سے رسولِ اکرمؐ مدینہ میں تشریف نہیں رکھتے تھے۔ چونکہ جناب اویس نے اپنی والدہ سے وعدہ کر رکھا تھا اس لیے ایک دو گھنٹے سے زیادہ نہیں رکے اور گھر لوٹ گئے۔

جب آنحضرتؐ واپس تشریف لائے تو دریافت فرمایا: یہ کیسا نور ہے جو ہم گھر میں دیکھ رہے ہیں؟

جواب میں آپ کو بتایا گیا کہ اویس نامی ایک شتربان وہاں آیا تھا اور پھر واپس چلا گیا۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: ...... اور یہ نور ہمارے گھر میں تحفے کے طور پر چھوڑ گیا۔ [2]

---

[1] ارشاد مفید (صفحہ ۱۴۹) [2] بحار الانوار (جلد ۴۲ صفحہ ۱۵۵)

رسول اکرمؐ فرمایا کرتے تھے: ہمیں یمن کی طرف سے بہشت کی خوشبو آتی ہے۔ نیز فرماتے تھے: اے اویس قرنی! ہمیں تم سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی فرماتے تھے کہ جو کوئی اس سے ملے ہمارا سلام اسے پہنچا دے۔

اویس قرنی نے کہا نے جو کچھ کہا اس سے ان کی عظیم روحانی زندگی کے مراتب کا پتا چلتا ہے:

"خدا کی قسم! موت کے بارے میں سوچنا اور روزِ قیامت کا خوف ایک باایمان شخص کے لیے دنیا میں خوشی کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔

اگر تمام مسلمان حق کی خاطر اٹھ کھڑے ہوں تو پھر کوئی ایسا شخص نہیں ملے گا جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کے باعث ہمیں برا بھلا کہے اور تہمت لگائے۔ تاہم اس کے باوجود ہم خدا کی خاطر قیام کرتے ہیں۔" [1]

۴۔ قنبر

جناب قنبر بھی ان حریت پسند اشخاص میں سے تھے جو رسولِ اکرمؐ اور حضرت علی علیہ السلام کی روحانی قوت سے اکتسابِ فیض کر کے بیحد بلند مقام پر پہنچے۔ انہیں سچی بات کہنے اور سیدھے راستے پر چلنے میں کوئی باک نہ تھا۔ اگرچہ بظاہر دنیا پرستوں کی نظر میں ان کی حیثیت ایک غلام سے

---

[1] سفینۃ البحار۔ جلد ۱۔ صفحہ ۵۳۔

زیادہ نہ تھی لیکن انہوں نے روحانی لحاظ سے اتنا بلند مرتبہ پایا کہ امام علیؑ کے اسرار کے محرم بن گئے۔

ان قوی الارادہ بزرگوار کے وہ زندہ اور پرجوش جملے بے حد مشہور ہیں جو انہوں نے ظالم جلاد حجاج بن یوسف کے سامنے ادا کیے جسے جرائم اور خونریزی کر کے خوش ہوتے کا مرض لاحق تھا۔

حجاج نے پوچھا: تم علیؑ کی خدمت میں کیا کرتے تھے؟

جناب قنبر نے جواب دیا: میں ان کو وضو کے لیے پانی پیش کرتا تھا۔

حجاج نے کہا: جب وہ وضو کر چکتے تھے تو کیا کہتے تھے؟

جناب قنبر نے جواب میں کہا: وہ یہ آیت پڑھتے تھے:

"جب انہوں نے ہماری یاد دلوں سے بھلادی تو ہم نے سبھی دروازے ان کے لیے کھول دیے حتیٰ کہ وہ جو کچھ ہم نے دیا اس سے خوش ہو گئے (پھر) ہم اچانک وہ سب کچھ ان سے واپس لے لیتے ہیں اور اسے ختم کر دیتے ہیں۔"

خدا کرے کہ ظالموں کی جڑ کٹ جائے... والحمدللہ رب العالمین۔

حجاج نے کہا: میرا خیال ہے کہ وہ اس آیت کا اطلاق ہم لوگوں پر کرتے تھے۔

جناب قنبر نے کمال دلیری سے جواب دیا: ہاں

حجاج نے کہا: اگر میں تمہیں قتل کر دوں تو تم کیا کرو گے؟

جناب قنبر نے جواب دیا: مجھے سعادت نصیب ہو گی اور تو بدبخت ٹھہرے گا۔[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۴۲ (صفحہ ۱۳۵)

حجاج نے کہا: اپنے مولا سے بیزاری کا اظہار کرو۔

جناب قنبر نے جواب میں کہا: اگر میں ان کا دین ترک کردوں تو کب تم میری رہنمائی اس سے بہتر دین کی جانب کرو گے؟

حجاج نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور کہا: میں تمہیں قتل کرنے والا ہوں۔ تم بتاؤ کہ تمہیں کس طرح قتل ہونا پسند ہے تاکہ میں تمہیں اسی طرح قتل کروں؟

جناب قنبر نے جواب دیا: اس بات کا فیصلہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔

حجاج نے پوچھا: کیوں؟

جناب قنبر نے جواب میں کہا: کیونکہ جس طرح تم مجھے قتل کرو گے اسی طرح تمہیں بھی قتل کیا جائے گا۔ میرے مولا نے مجھے خبر دی ہے کہ مجھے ظالمانہ طور پر اور ناحق قتل کیا جائے گا۔

حجاج نے حکم دیا کہ ان کی گردن اڑا دی جائے۔[1]

"جن لوگوں نے کہا کہ "اللہ" ہمارا پروردگار ہے اور پھر اس پر مضبوطی سے قائم رہے" ان پر رحمت کے فرشتے نازل ہوں گے اور کہیں گے کہ کچھ خوف نہ کرو اور غم نہ کھاؤ جس بہشت کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اس کی خوشیاں مناؤ۔"[2]

□□□□□□□□□□□□□□

کتاب ۱۰، ۱۴، ۱۰۱ ان موسیٰ

---

[1] ارشاد۔ مفید (صفحہ ۱۵۵) [2] سورۃ حٰم سجدہ۔ آیت ۳۰

امامیہ لائبریری

امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان

لاہور ڈویژن موچی گیٹ یونٹ۔

۱۔ ہر کتاب [illegible] کو صحیح کرائی جائے۔

تاریخ اجراء	تاریخ اجراء	تاریخ اجراء	تاریخ اجراء